DAMAGE BOOK

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222277
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥٤٣٣٤ Accession No. ٩٩٣٧ 9937

Author ت - م تاجور

Title منتخب افسانے جلد ششم

This book should be returned on or before the date last marked below.

اُردو مرکز لائبریری ...

اردو ادب کے معیاری مختصر افسانوں کا عملی انتخاب

منتخب افسانے

جلد ششم

مُرتبہ

مولینا تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر انتخاد

باعانت

حضرات اراکین اُردو مرکز لاہور

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلیشرز لاہور

اُردو مرکز لاہور

ملک کی واحد اکیڈمی (اُردو مرکز لاہور) انتخاب ہفت کشور پنجاب کے دارالسلطنت لاہور
میں ذیل کے اہم مقاصد کی تکمیل کے لیئے ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے۔

(۱) اُردو لٹریچر کے ذخیرۂ بیکراں میں سے اُن جاندار اور مفید حصے کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ حتی الامکان تاریخی ترتیب کے ساتھ مجلدات میں شائع کرنا۔

(۲) اُردو زبان کی مکمل انسائیکلوپیڈیا کی تالیف۔

(۳) ایک جامع اُردو لغات کی ترتیب۔

(۴) اُردو مرکز کی مجلس ادبا (جو درحقیقت اردو زبان کے لئے ایک ادبی دارالافتا ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع و متنازع فیہ امور کے متعلق ناطق فیصلہ کرنا۔

ایک باوقار علمی جماعت جسمیں ملک کے سر برآوردہ اہلِ قلم اور منتخب انشاپرداز شریک ہیں اُردو مرکز مذکورہ بالا اہم مقاصد میں سے پہلے مقصد کی تکمیل پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئے ہے اسکی پہلی زرین کوشش تیس گرانقدر مجلدات کی صورت میں قدر شناس نگاہوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ آنریبل سر شیخ عبدالقادر بالقابہ۔ خان بہادر شیخ نورالٰہی آئی۔ ای۔ ایس۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے اُستادانِ ادب کے مشوروں کے ماتحت یہ مجلدات جماعت اُردو مرکز نے ترتیب دئیے ہیں۔ قدر شناس اہلِ نظر نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ تو ہم کم و بیش ڈیڑھ سو مجلدات شائع کرکے اردو مصنفین کو بڑی بڑی لائبریریوں سے بے نیاز کردینگے۔

تاجور نجیب آبادی۔ پروفیسر کالج۔ ایڈیٹر اُنجمن و چیف ایڈیٹر اردو مرکز لاہور

کیور آرٹ پرنٹنگ ورکس ابو گورانند تہ مل چھپا۔

فہرست جلد ششم

Checked 19

صفحہ	فسانہ نگار	فسانہ	نمبر شمار
۱	حکیم احمد شجاع صاحب بی۔ اے اسسٹنٹ سیکرٹری لیجسلیٹو کونسل پنجاب	آرام شاہ کی بیٹی	۱
۲۷	سید عابد علی عابد بی۔ اے ایل ایل بی پلیڈر	نوشتہ خونی	۲
۵۱	مسٹر محمد دین تاثیر ایم اے لیکچرار اسلامیہ کالج لاہور	شاہ کار	۳
۶۰	سید سجاد حیدر یلدرم بی اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی	صحبت ناجنس	۴
۸۱	جناب تیرتھ رام فیروز پوری	ہڈیوں کا پنجر	۵
۹۰	سید امتیاز علی تاج بی اے	تخفیف جرم کی وجہ	۶
۱۰۰	جناب لطیف الدین احمد اکبر آبادی	صحیح غلطی	۷
۱۰۲	مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی بی اے	قطرہ میں طوفان	۸
۱۱۵	سید ابو محمد ثاقب کان پوری	تخیل محبت	۹
۱۲۲	شیخ محمد ضیاء الدین شمسی جرنلسٹ	بدگمانی	۱۰

منتخب افسانے

جلد ششم

آرام شاہ کی بیٹی

(از جناب حکیم احمدؒ شجاع صاحب بی۔اے علیگ)

(۱)

آرام شاہ اپنے ملک کا خود مختار بادشاہ تھا۔ خود مختاری ان معنوں میں آج تک ناممکن چیز ہے۔ ایک بری چیز ہے ——— اس کی زبان کا لفظ ملک کے لئے قانون تھا۔ اُس کا حکم اور اُس کے حکم کی تعمیل ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ کسی امر کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ صرف اُس کی رائے کر سکتی تھی ———

وہ دنیا کے پُرانے تاجداروں کی نسل کا ایک زندہ اور متحرک ثبوت تھا۔ وہ اپنے قد اپنے بدن اپنے حُسن ہر لحاظ سے ایک بادشاہ تھا ——— اس کا دل سنگِ خارا کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس کو صرف محبت کے بے پروا شعلوں نے دو مرتبہ نرم کیا تھا۔ اور دونوں مرتبہ اُس نے اس طرح محبت کی تھی جس طرح صرف ایک مضبوط اور تندرست شخص ہی کر سکتا ہے۔ یعنی اُس نے اس نئے جذبے کیلئے

اپنا دل اور تمام جذبات سے خالی کر دیا—— وہ بادشاہ تھا۔ اور صرف فاتح یا مفتوح ہونا جانتا تھا۔

پہلی دفعہ اس کو اس عورت سے محبت ہوئی جس کو اس نے خدا جانے کتنی اور کیسی قربانیوں کے بعد اپنی ملکہ بنایا۔ کہتے ہیں۔ اُس وقت بہت سے بادشاہ جو آرام شاہ اور اس کی سلطنت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے مایوس ہوئے اور بہت سی شہزادیاں جو آرام شاہ کی جوانی اور دولت کو اپنی آیندہ ملکیت سمجھتی تھیں۔ دل پکڑ کر رہ گئیں—— آرام شاہ کی ملکہ ایک غریب گڈریے کی بیٹی تھی——

شادی کو ابھی چند ہی روز گزرے تھے۔ کہ آرام شاہ کے مشاغل میں ایک تغیّر واقع ہوا اُسے اپنی سلطنت کی وسیع حدود کچھ تنگ تنگ نظر آئیں۔ اُس نے اپنے خزانے کے مال و اسباب میں ایک ناقابل برداشت کمی محسوس کی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں اُس نے اردگرد کے علاقوں کو تسخیر کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر ہر روز وہ اپنے تخت کو ضرورت سے کم بلند اور اپنے تاج کو حیثیت سے کم مغرور پاتا تھا۔ وہ جس وقت بیگم کے پہلو میں بیٹھتا۔ کوئی آواز اس کے کانوں میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی۔ اور وہ چلّا اٹھتا "بے شک یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں صرف اسی لئے بنائی گئی ہیں کہ میرے قبضے اور تصرف میں آئیں" مگر بیگم کی ناگہانی وفات کے بعد آرام شاہ وہ آرام شاہ نہ رہا۔ اُسے اپنی زندگی کچھ زیادہ لمبی اور اپنے کاروبار بہت ہی وقت طلب دکھائی دئے۔ بیگم کے مرتے ہی اُس نے اپنے دل کو عورت کے خیال سے خالی کر دیا۔ یہ اُس کے خیال

میں مرحوم ملکہ کی محبت کا خراج تھا۔ جو اس نے ادا کیا۔ اس لئے ان تمام لطیف چیزوں کے لئے جو اس کی دولت مہیا کر سکتی تھی۔ مگر جو ایک عورت کی موجودگی کے بغیر ایک مکروہ ٹھوس اور ناجائز صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اپنے تنومند دل کو بے حس بنا لیا....۔۔۔۔۔

دوسری دفعہ جب محبت نے اُس کی آنکھوں میں جو باوجود دن رات کھلے رہنے کے تاریکی کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ دنیا کو روشن کیا۔ وہ لمحہ تھا۔ جس میں اُس نے اپنی اکلوتی بچی مرحوم ملکہ کی اکیلی یادگار کو اس کی عمر کے تیرھویں سال میں پہلی مرتبہ دیکھا۔

پیدا ہوتے ہی اُس معصوم لڑکی کو اس جنگ جُو اور وحشی خاندان کی رسم کے مطابق جس میں اولاد کو محض اس جرم کے لئے کہ اس کی محبت والدین کے دل سے جبر و قہر کے ضروری جذبات کو چھین لیتی ہے۔ ماں باپ کے پُر شفقت سائے سے الگ کر کے اُس کے ننھیال بھیج دیا گیا تھا۔

وہ دامن کوہ میں ایک شفاف چشمہ کے کنارے بھیڑیں چرا رہی تھی۔ اور ایک شیر کی کھال کا جامہ جسے اس کے بوڑھے نانا نے چند روز ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کی مہیب قوت سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے لمبے اور گستاخ بال اُس کے ہاتھ کی کوششوں کو جو اُن کو اُس کی سیاہ اور روشن آنکھوں پر سے ہٹانے میں مصروف تھیں شکست دے رہے تھے۔۔۔۔۔

یہی وہ وقت تھا جب آرام شاہ نے اُسے پہاڑی کی چوٹی سے دیکھا۔ وہ ایک پہاڑی قوم کی سرزنش کے لئے جا رہا تھا۔ کیونکہ ان کے علاقہ میں اسکا ایک

گھوڑا کھو گیا تھا۔ اور اُس نے یہ خبر سنتے ہی عہد کر لیا تھا۔ کہ اس علاقے بھر میں کسی فردِ واحد کے اصطبل میں کوئی گھوڑا نہ رہیگا۔ ...... مگر وہ اس گڈریے کی لڑکی کو جسے وہ اس کے سوا اور کچھ تصور نہ کر سکتا تھا۔ دیکھکر ٹھٹکا ——— لشکر کو وہیں ٹھیرنے کا حکم دیا اور خود اکیلا پہاڑی کے نشیب کی طرف چلا۔ سپاہی سوچتے ہیں کہ جو بادشاہ اس طرح تن تنہا اپنی بہادری اور جرأت کو آزمائش میں ڈالے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہا کرتا۔

وہ پہاڑی سے اُتر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کے دل کے سمندر میں ایک طوفان اُٹھ رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی سلطنت میں ایک بغاوت ہو گئی ہے۔ گھوڑے کی رفتار کی لغزش۔ سوار کے ہیجان اور بے چینی کی چغلیاں کھا رہی تھی۔

باپ نے بیٹی کو دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے چہرے کو ایک ایسے آئینے میں دیکھ رہا ہے۔ جس میں اُس کے نقش کچھ چھوٹے مگر بہت زیادہ لطیف اور حسین ہو گئے ہیں۔ اُس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے بند ہو کر کھلیں۔ مگر اب اُن سے آنسوؤں کی ایک ندی جاری تھی۔ آج اُس نے گھوڑے سے اُترتے وقت اپنے آپ کو معمول سے زیادہ ہلکا محسوس کیا ——— بڑی ہچکچاہٹ۔ مگر بڑی بے تابی سے اُس نے لڑکی کی دائیں کلائی پکڑنے کی کوشش کی ———

لڑکی جو باوجود ایک اجنبی مرد کو اس عالم تنہائی میں اس قدر قریب دیکھنے کے کسی غیر معمولی وجہ سے بھاگ نہ سکی تھی۔ اب یہ حرکت محسوس کر کے ایک زخمی شیرنی کی طرح اُچھلی۔ مگر آرام شاہ اس بھیڑیں چرانے والی لڑکی کی دائیں

کلائی پر اپنے مغرور خاندان کا شاہی طغرہ جو تپائے ہوئے لوہے کے غیر فانی نقوش کی صورت میں روشن تھا دیکھ چکا تھا۔

لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اور اپنے بلند قد کو اور بلند کر کے کہا "شاید تم نے مجھے ایک غریب بے کس گڈریے کی بیٹی سمجھ کر یہ جرأت کی ہے" اور پھر اپنی دائیں کلائی کو ایک پروقار حرکت دے کر۔ جس سے فضا میں ایک ہلال چمک گیا۔ ایک ایسے لہجے میں جس کی لرزش شاہی سطوت کی رازداری تھی چلّا کر کہا "دیکھو اس سرزمین کے قہرمان آرام شاہ کی بیٹی کو پہچانو۔ باپ نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو۔ جو بڑے بڑے سرکش پہلوانوں کا سر کاٹتے وقت بھی نہ کانپتے تھے بڑھا کر بھرائی ہوئی، کمزور آواز میں صرف اتنا کہا "میری بچی! میں اسے تیرے کہنے سے پہلے پہچان چکا ہوں"۔ اور پھر اُسے اپنے آغوش محبت میں چھپا لیا

(۲)

آرام شاہ اپنے مجرموں کو سزا دینا بھول گیا۔ اپنے ظالمانہ مقصد کی تکمیل کے لئے ایک قدم نہ اٹھا سکا۔ وہ اب کسی کو سزا دینا نہ چاہتا تھا —— اس کی نظر میں اب کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کے لئے انسان انسان کو سزا دے سکتا ہے —— کیا قدرت نے اس کے جبر و قہر کے عوض میں ایک غیر محدود محبت، ایک لاانتہا رحم سے کام نہیں لیا تھا؟ ——

وہ واپس آیا۔ اس کے درباریوں نے سہمی ہوئی نظریں اٹھا کر جو بار بار اسکے خونخوار رعب کی یاد سے جھک جاتی تھیں، اور پلکوں کی چادر دیواروں میں پناہ لینے کے لئے بند ہو جاتی تھیں، اس کی طرف دیکھا —— مگر اب اسکی آنکھوں

میں ایک غیر معمولی حلاوت، اس کی پیشانی پر ایک غیر معمولی سکون، اس کے لبوں پہ ایک غیر معمولی مسکراہٹ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تاریک اور بھیانک رات میں چاند نکل آیا ہے، یا ایک خشک اور بنجر بیابان قدرت کے کسی معجزے سے یک لخت سرسبز و شاداب ہوگیا ہے۔

اس نے گھوڑے سے اُترتے ہی اپنے ملک اور خاندان کی روایات کے خلاف ایک ایسا حکم دیا۔ جس کو بعض نے حیرت و استعجاب، بعض نے غصّے اور نفرت، اور بعض نے مسرت و اطمینان سے سنا، اس نے اپنے ہاتھوں سے، جو اس وقت اس طرح کانپ رہے تھے جس طرح کسی خوفناک آندھی کے جھونکوں سے درختوں کی نازک ٹہنیاں کانپتی ہیں، لکھ دیا کہ آئندہ کوئی بچہ اپنی ماں کی آغوشِ محبت اور باپ کے دامانِ شفقت سے جُدا نہ کیا جائیگا ——— وہ قدرت کی اس گراں قدر نعمت کا راز سمجھ چکا تھا ———

اب فریادی اس کے دربار میں ایک اعتبار سے آتے تھے، اب اس کا پایۂ تخت جو اس سے قبل ہمیشہ ایک فوجی کیمپ کی کیفیت اختیار کئے رکھتا تھا، ایک ہرا بھرا گلشن نظر آتا تھا، اب اس کے شاہی باغوں میں، اس کے محل کی آرام گاہوں میں، اس کے شہروں کے گلی کوچوں میں، بچے بے دھڑک کھیلتے دکھائی دیتے تھے ——— یہ اصولی تغیر اس کی سلطنت کا سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ عجیب، اور سب سے زیادہ حیرت ناک واقعہ تھا۔

آرام شاہ نے ایک بڑے شاندار جلسۂ دعوت میں، جس میں صرف ایسے لوگ مدعو کئے گئے تھے جو صاحبِ اولاد تھے، اور جن کو حکم ... ا گیا تھا کہ وہ اپنے

اپنے بچوں کے ساتھ اس جشن میں شریک ہوں۔ اپنی بیٹی کی سالگرہ منائی، اور اس کیلئے ایک نیا نام تجویز کیا۔ اس دن ایسے لوگوں نے جن کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ یا جو شادی کرنا نہیں چاہتے تھے یا جو صاحب اولاد نہ تھے، اپنے آپ میں ایک کمی محسوس کی۔ انسانیت کے اعتبار سے اپنے آپ کو یقینی طور پر غیر مکمل سمجھا۔ وہ کم از کم کی ایک خاص مسرت میں حصہ لینے کے حق دار نہ تھے۔ اس وقت ان کو ایک گھر کی ذمہ داریوں کا تردد، اہل و عیال کی پرورش کا بار گراں، اس بڑی کمی کے مقابلہ پر بہت ہلکا بہت بے حیثیت اور بہت خیالی نظر آیا۔

دل آرام۔ یہ شاہزادی کا نیا نام تھا —— اپنی عمر کی سولھویں منزل میں قدم رکھ چکی تھی۔ مگر ابھی تک اس کی شادی کے متعلق کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ آرام شاہ اپنی بچی کی جدائی برداشت نہ کر سکتا تھا، اس جدائی کے خیال سے بھی گھبراتا تھا۔ وہ خود کسی غیر معلوم جذبے سے مجبور ہو کر، جس کو وہ کسی سے کہنا نہ چاہتا تھا، شادی کرنے سے معذور تھا۔ اور اس لئے اسکے برباد محل، ویران دل، اور بے چراغ سلطنت کی آبادی صرف دلارام کی ہستی پر منحصر تھی۔

ایک دن آرام شاہ اپنے پائیں باغ میں سنگ مرمر کے ایک کشادہ چبوترے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمبیلی کی ایک نازک اور خوشبودار ٹہنی تھی، جس کے لچک دار جسم کی ضعیف طاقت کو وہ اپنی مضبوط پنڈلیوں پر آزما رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے، کھلے چمن میں، بہت سے بچے کھیل رہے تھے —— وہ کسی عمیق خیال میں مستغرق تھا۔ اس نازک خوش

تھپکیاں اسے اس خیال کے سحر آلود نشہ میں مدہوش کر رہی تھیں۔ ایک ٹہنی سے کھیلنے کی یہ طفلانہ مصروفیت، حقیقت میں اس کے تخیل کی پرواز کے لئے ایک تازیانہ، اس کے دماغی انہماک کے لئے ایک بہانہ تھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ مگر وہ اسی ایک خیال کی مختلف متحرک تصویروں کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔

یک لخت، بغیر اس لمحہ سے قبل محسوس کئے، اس کے دماغ پر ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ اور اس نے دیکھا، کہ ان کھیلنے والے بچوں میں سے ایک ننھا سا بچہ دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے چیٹ گیا ہے اور اپنی ننھی ننھی، روشن اور متحرک آنکھوں کو اس کے چہرے کی طرف اٹھائے، ایک پرامید نظر سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ آرام شاہ نے اپنے قوی اور وسیع بازو پھیلا کر اسے اٹھالیا۔ اور ایک پرکیف محبت، ایک دلی خلوص سے اپنے کشادہ اور دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔

بچے نے حوصلہ پا کر ایک مچلے ہوئے انداز سے صرف اتنا کہا "یہ چھڑی ہمیں دے دو" اور کسی جواب کا انتظار کئے بغیر ایک جرأت سے بھری ہوئی آزادی سے، جو صرف ننھے، معصوم بچوں ہی کا حق ہے، اس چھڑی کو اٹھا کر —— اپنی بیباک محبت اور نڈر خلوص کے اظہار کے لئے آرام شاہ کے سینے کو چوم کر اور پھر اس ملک کے قاہر فرمانروا کے زانوؤں پر پاؤں رکھ کر وہ بچہ زمین پر کود اور بھاگ گیا۔

آرام شاہ کی آنکھوں سے اس کے گرم رخساروں پر دو بڑے بڑے آنسو
اس کو اپنے دل کا ایک کونا خالی نظر آیا۔ اس نے اپنے سینے کے اندر ایک
کی۔ اس کے ہاتھوں کی نیلی نیلی رگیں اس کے سرخ خون کے
گئیں۔ مگر اس تمام جسمانی اور روحانی کاوش کے دوران میں

اس نے اپنے عقدے کا حل سوچ لیا۔ اب اس کا دماغ اس کے تخیل کے صبر آزما آشوب سے خالی تھا۔ اور اس کی آنکھیں اپنے سامنے اس ہرے بھرے گلشن میں، ہنستی ہوئی کھیلتی ہوئی، دلارام کے سوا اور کسی کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے ایک لمبی اور گہری آہ بھری۔ اب وہ آہستہ آہستہ چبوترے کی سیڑھیوں سے اُتر کر اپنی محل سرائے کے پرشوکت دروازے کی طرف جارہا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک باپ کی ذمہ داری محسوس کر رہا ہے۔

دوسرے ہی دن شاہزادی کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ نقیب دور دراز کے شہریاروں کے لئے دعوت کا پیغام لے کر روانہ ہوگئے۔ اس ملک میں لڑکیاں ماں باپ کی مرضی کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھائی جاتی تھیں لڑکیوں کو محض ایک جائداد کی طرح، سب سے بڑی قیمت لگانے والے کے ہاتھ بیچ نہیں دیا جاتا تھا، دوسرے لوگوں کی رائے کا معیار لڑکیوں کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرتا تھا، زندگی بھر کے شریک کے انتخاب کے لئے رسمیات کی غلامانہ پابندی نہیں کی جاتی تھی، ایک بے زبان، معصوم اور کمزور مخلوق پر ظلم کرنے کے لئے حیا اور شرم، شرافت اور غیرت کو بہانہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ بلکہ رائے کی آزادی کو انسان کا بہترین حق سمجھا جاتا تھا، حق انتخاب کو عورت کا سب سے بڑا اور نہ تصور کیا جاتا تھا۔ تقدیر کے شکووں سے پہلے مداوا تلاش کیا جاتا تھا، اور لڑکیوں کو اپنی زندگیوں کا مختار سمجھ کر ان کی عقل اور پسند کو کم از کم اپنے معاملات کے انصرام کے اہل جان کر ان کی ذمہ داری کے احساس پر، ان کی قوت فیصلہ کے معیار پر اعتبار کیا جاتا تھا۔

یہ دعوت کے پیغام اس لئے بھیجے گئے تھے کہ سب خواہشمند والیانِ ملک آئیں تاکہ شاہزادی کو انتخاب کا موقعہ میسر آئے۔ اور ان میں سے جو خوش قسمت

شاہزادی کے انتخاب کی آزمایشوں میں پورا اُترے اس کو اس کی عمر بھر کا رفیق بنادیا جائے۔

ادھر تو یہ پیغام گئے۔ ادھر آرام شاہ نے اپنے خاص اہل کار شادی کا سامان بہم پہنچانے کی غرض سے دوڑا دئے۔

ہر اہل کار کو آرام شاہ نے اپنے خلوت کے کمرے میں بلاکر رخصت کیا۔ یہ اعزاز آرام شاہ کی سلطنت میں کسی خوش نصیب ہی کو حاصل ہوتا تھا۔ ان تمام رخصتی ملاقاتوں میں آرام شاہ اپنی ایک ہی خواہش مضطرب' ایک ہی آرزوے بیقرار کو دہراتا تھا۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ دلارام کی شادی کے لئے جو سامان آئے وہ نایاب ہو۔ ان میں وہ لوگ جو شاہزادی کے خلعت عروسی کے مختلف اجزاء بہم پہنچانے کے لئے گئے۔ خاص طور پر' بہت سوچ سمجھ کر' منتخب کئے گئے تھے۔

آرام شاہ نے ان کو بہت التجا کے ساتھ تاکید کی۔ اس التجا میں کچھ ایسا تحکمانہ انداز تھا۔ کہ یہ اہل کار اپنے کام کی ذمہ واری کو محسوس کر کر کے کانپ رہے تھے۔ آرام شاہ اپنے ہر ایک فقرے کو دو دو تین تین مرتبہ دہراتا تھا۔ اہل کاروں کے کان ایک نرم' حاجت مند اور مجنونانہ درخواست سن رہے تھے۔ مگر ان کے دماغ ان کو بتا رہے تھے۔ کہ آرام شاہ کے سے خود مختار اور قاہر بادشاہ کی نرمی کو سختی میں تبدیل ہوتے دیر نہیں ہوتی۔ ان کی آنکھوں کو' اشیاے مطلوبہ کی تلاش کے لئے' دنیا بھر کی وسعت تنگ نظر آتی تھی۔ ان کے دل اس فرض کے بارگراں کے احساس سے بیٹھے جاتے تھے۔ ان کا پچھلے دنوں کا تجربہ ان کو ایک باپ کی آرزو پرور محبت کے سبق سکھا چکا تھا۔

آخر وہ دن جس کا انتظار تھا آگیا۔ دور دور کے شہزادے اور فرمانروا آرام شاہ

کی بیٹی کی پسند کے سامنے اپنی ذاتی شباہت اور خاندانی وجاہت کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ شہزادی کا خلعت عروسی تیار ہو گیا۔ جہیز کا سامان آرام شاہ کے مضبوط قلعے کے تہ خانوں میں مقفل کر دیا گیا ـــــ آرام شاہ نے اس تمام سامان کو دیکھا، اپنی بیٹی کے قیمتی اور خوبصورت لبادے کا ہر ایک ماہر اور باریک بین جوہری کی نظر سے مطالعہ کیا۔ اور پھر اپنے بلند، قوی اور تندرست گھوڑے پر سوار ہو کر اس وسیع میدان پر نظر ڈالی۔ جس میں ایک عورت کی محبت کو جیتنے کی کوشش کرنے والے قطار بار خیمہ زن تھے۔ اور ظاہرا طور پر بڑی بے صبری بڑی حسرت بڑی امید سے دوسری صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے اطمینان اور تسکین سے بھرتی ہوئی ایک لمبی سانس لی۔ مگر جب اس کے بلند پرواز تخیل نے اس کے دماغ کے کان میں اتنا کہا۔ کہ شاید ان بے شمار طالبوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے۔ جو دلارام کو ہمیشہ کے لئے اس سے جدا کر دیگا، تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر محض اس خیال سے بھاگنے کے لئے اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا اُڑا، اور چشم زدن میں شاہی محل سرا کے دروازے کے اندر غائب ہو گیا۔

نصف شب گزرنے کو تھی مگر ابھی تک شہزادی اپنے غسلِ عروسی کی رسمیات سے فارغ نہ ہوئی تھی۔ شاہی عبادت گاہ میں، اس فطرت پرست ملک کی رسم کے مطابق شب زندہ دار عابد قدرت کی طاقتوں کے ہر بڑے مظہر سے شہزادی کی آئندہ زندگی کے لئے خیر و برکت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اس معبد کے ایک گمنام کونے کے قریب آج خلاف معمول آرام شاہ بھی اپنے سیاہ فرغل میں چھپا ہوا سربسجود پڑا تھا۔ اس کی گھنی، اور سیاہ داڑھی اس کے غیر تناہی آنسوؤں سے

تر تھی۔ بار بار کسی اندرونی تقاضے کے بے خبر اضطراب سے وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا تھا۔ اور دل ہی دل میں اپنی خواہشوں، اپنی آرزوؤں، اپنی حاجتوں کو محسوس کرتا تھا۔ اس کا دماغ ان جذبات سے بھری ہوئی دعاؤں کو ترتیب دینے سے قاصر تھا۔ اسکی زبان ان بے ترتیب دعاؤں کو الفاظ میں متشکل کرنے سے عاجز تھی۔ آج پہلی دفعہ اس کو ایک اپنے سے زیادہ بڑی طاقت کا احساس ہوا تھا۔ آج اپنی زندگی بھر میں پہلی مرتبہ وہ اپنی حاجتوں کو ایک اپنے سے زیادہ بڑے حاجت روا کے دربار میں پیش کرنے سے نہیں شرمایا تھا۔

اُدھر ایک سو ایک بڑی بوڑھی سہاگنیں شہزادی کو غسلِ عروسی دینے میں مصروف تھیں صحت بخش جڑی بوٹیوں کے عرق، خوشبودار پھولوں کے عطر، خوش رنگ مرکبات کے غازے، مذاقِ مہذب کی حسین ترین جلوہ فرمائیوں کو موثر بنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جا رہے تھے۔ شاہی حمام کے بیرونی برآمدوں میں بے شمار کم سن کنیزیں ایک ریشمی نغمہ کی پیہم، دلکش، دردانگیز اور ہم آہنگ سروں سے ہوا کے ذروں کو مدہوش کر رہی تھیں۔ یہ کنیزیں جن میں سے ہر ایک حسنِ صورت کے لحاظ سے ایک ملکہ تھی، فطرت کی بے ترتیب اور بے اصول فرمائیوں کی بدولت جن کو لوگ سوءِ اتفاق، بدقسمتی، یا اسی قسم کے دوسرے بے معنی ناموں سے خطاب کرتے ہیں۔ ایسے غریب ماں باپ کے گھروں میں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنی غریبی سے لڑنے کے لئے ان معصوم بچیوں کو اپنا ہتھیار بنایا۔ چاندی سونے کے چند بے حقیقت ٹکڑوں کے لئے اپنی سب سے بڑی دولت کو انسانی زندگی کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ان کے نغموں میں خوشی کی جھنکار تھی! اسلئے کہ یہ ان کی پیاری دلارام کی، جس کے لئے ان کے دلوں میں محبت کے سوا اور کوئی جذبہ نہ تھا، شادی کی تقریب تھی، مگر ہر نغمۂ مسرت کی اُٹھتی ہوئی لے ایک

فریاد کی درد ناک دھن میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس حقیقت کو محسوس کر رہی تھی کہ اس کی زندگی' اس امیدوں سے بھری ہوئی رات' سے خالی ہے۔ آہ انسان کی ہوس کاریوں کا جھوٹا محل کتنے انسانی حقوق کے کھنڈروں پر تیار کیا جاتا ہے!

آخر کار اس غسل کی لمبی اور تھکا دینے والی رسوم اختتام کو پہنچیں۔ اور شہزادی خواصوں اور باندیوں کے عقد ثریا کے ساتھ ساتھ اپنی محلسرا کے آئینہ خانے کے دروازے تک آئی۔ یہاں رک کر سب نے پھر ایک مبارکباد کا نغمہ لگایا۔ اور سات چیدہ خواصوں کے سوا' جن کے ہاتھ مشاطگی' اور آرائش کے فنون میں شہرہ آفاق تھے' سب رخصت ہو گئیں۔

شاہزادی آج پہلی دفعہ اپنی ان سات حسین' نازک اندام' اور چابکدست خواصوں کے ہمراہ شاہی آئینہ خانے میں داخل ہوئی۔ اس وحشی مگر عاقبت اندیش ملک کی رسم کے مطابق کنواری لڑکیوں کو اپنی شب عروسی سے پہلے آئینہ دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ تاکہ ان کا حسن اپنی طاقت کے نشہ سے غیر متاثرہ کر اپنی ماہیت سے بے خبر رہ کر مردوں کی زندگیوں کو گھروں کے امن کو' عصمت و حیا کی نازک دیواروں کو غارتگر حملوں سے محفوظ رکھے۔

دلارام نے اپنی آنکھوں سے' آج پہلی دفعہ اپنے حسن بے حجاب کو دیکھا' وہ آئینوں کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی۔ گویا وہ اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتی۔ ایک غیر عورت کو جسے اس نے آج تک نہ دیکھا تھا اس بے تکلف کیفیت سے اپنی طرف حیرت اور استفہام کی نظریں ڈالتے دیکھ کر وہ گھبرائی۔ اس نے جس آئینے میں دیکھا۔ اس کو وہی ایک ہی تصویر نظر آئی۔ بے جان آئینوں کی اس چھیڑ چھاڑ کو اس نے اسی تعجب' اسی غصے سے دیکھا۔ جس سے مشتعل ہو کر ایک نادان'

چڑیا آئینے کے ساتھ جنگ آزما ہوتی ہے۔

آخر وہ کچھ تھک کر، کچھ مایوس ہو کر، کچھ سمجھ کر، ایک نرم اور آرام دہ دیوان پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں اپنے سامنے کے آئینہ میں گڑی ہوئی تھیں۔ مگر اس کا دماغ اس آئینوں کی دنیا سے الگ اپنا کام کر رہا تھا۔

خواصوں نے، بڑی احتیاط سے، شاہزادی کا عروسی لبادہ بڑے بڑے آہنی صندوقوں سے نکالا۔ اور اس کے ایک ایک پارچے کو زریں اور جواہر نگار خوانچوں میں سجایا۔ پھر نہایت ادب و احترام سے ان خوانچوں کو، شاہزادی کے سامنے قرینے سے رکھ دیا۔ سونے چاندی کے باریک تاروں سے بُنے ہوئے لباس پر دُنیا کے نایاب جواہرات کی چکاچوند دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی زرتار اور زرفشاں باغ میں بہار آگئی ہے۔ یا ایک درخشاں جواہرات کا خواب ہے۔ جو کسی خورشید لقا مہ جبیں کے یکایک بیدار ہونے سے بکھر گیا ہے۔ شاہزادی نے آئینے کی گہرائی میں پہلے سے زیادہ روشنی اور چمک محسوس کی، اور جب ذرا گھبرا کر، اپنی گڑی ہوئی نظر کو ہٹا کر، اس نے انسانی دستکاری اور قدرتی صناعی کی مجتمع کوششوں کو اس لباس کی صورت میں جلوہ گر دیکھا۔ تو خوشی یا حیرت یا خدا جانے کس جذبے سے متاثر ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ مُودب خواصین یہ سمجھ کر کہ رات بھر کے جاگنے کے بعد شاید شاہزادی کو آرام کی ضرورت ہے۔ اور یہ آنکھوں کا جھپکنا اس ضرورت کا قدرتی اظہار ہے۔ چُپ چاپ دبے پاؤں پیچھے ہٹ گئیں اور بیرونی برآمدے میں دست بستہ کھڑی ہو گئیں۔

شاہزادی کے مصروف دماغ نے اس کی بند آنکھوں کے سامنے ایک نئی دُنیا کے دروازے کھول دئے۔ وہ ہوش میں تھی، بیدار تھی، مگر اس کو اس وقت اس حقیقت بیدار کا احساس نہ تھا۔ . . . . . اس نے دیکھا کہ اپنے نانا کے گاؤں

یں، جس میں اس نے اپنے بچپن کا زمانہ گزارا تھا، اس کی بچپن کی سہلیاں، اسی میدان میں جہاں وہ اپنی فطری آزادی، اور بیباکی سے کھیلا کرتی تھیں، مغموم اور اُداس بیٹھی ہیں۔ یہ بڑے شوق، بڑی محبت سے ان کی طرف بڑھی۔ مگر اسکو دیکھتے ہی ان کے مغموم اور مُرجھائے ہوئے چہروں پر ایک سراسیمگی، ایک وحشت نمود آئی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے نہیں پہچانتیں۔ دلارام نے ذرا آگے بڑھ کر ان کو ان کے پیار کے ناموں سے جن سے وہ ہمیشہ ان کو خطاب کرتی تھی اور جن کو وہ اب تک نہ بھولی تھی بلایا۔ مگر اس اظہار واقفیت سے ان کی حیرانی اور پریشانی میں اور اضافہ ہوا۔ اور دلارام جس قدر آگے بڑھی تھی۔ وہ اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ پیچھے ہٹ گئیں۔ شاہزادی نے متحیر ہو کر سوال کیا" ہائیں تم اپنی پرانی سہیلی، اپنی پیاری بہن کو اتنی جلدی بھول گئیں"۔

ایک آواز جس میں انتقام کا زہر ملا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں سُنائی دی" کس کی سہیلی، کیسی بہن"۔

شاہزادی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا" کیا محبت، اس قدر جلدی نفرت، سے بدل سکتی ہے؟"

وہی آواز جس سے اب ایک مصیبت زدہ عورت کی آزردگی مترشح تھی۔ پھر سنائی دی" محبت کے نام کو ناپاک نہ کرو۔ آؤ اپنی محبت کو اپنی آنکھوں سے دیکھو"۔

اتنے میں شاہزادی نے دیکھا۔ کہ اس کی پرانی سہیلیاں ایک لمبی قطار میں گاؤں کی گنجان آبادی کی طرف چل دیں۔ شاہزادی ایک مقناطیسی کشش سے مجبور ہو کر ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ اس نے دیکھا۔ کہ ایک تاریک اور لمبے دالان میں بہت سی عورتیں، جن کے چہروں پر غریبی اور مفلسی کے گہرے نقش موجود تھے۔ جلدی جلدی ریشم اور اون کے ڈوروں، سونے اور چاندی کے تاروں کو

ملا ملا کر مختلف کپڑے بُن رہی ہیں۔ اور جب کبھی ان کا ہاتھ سُست پڑ جاتا ہے یا ان کی نظر تھک کر کام کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔ تو ایک قوی ہیکل حبشی غلام ان کی ننگی، اور مُشت استخواں پیٹھ پر چمڑے کا ایک کرخت کوڑا رسید کرتا ہے جس سے ان کے زرد اور بے رونق چہروں پر درد کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کے کمزور لبوں سے ایک فریاد نکلتی ہے۔

اس دالان کے ایک کونے میں شہزادی نے ننھے ننھے، دودھ پیتے بچوں کو جو سردی کی شدت سے سکڑے جا رہے تھے بلبلاتے ہوئے دیکھا۔ انکی ماؤں کو اجازت نہ تھی کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اگر گرم کپڑوں سے نہیں تو اپنی چھاتیوں سے ہی لگا کر اپنی ماتا کی حرارت سے گرمی پہنچائیں اور ان کے سوکھے ہوئے لبوں کو اگر اس دنیا کی نعمتوں سے نہیں تو قدرت کے سات دن جاری رہنے والے سرچشمۂ حیات سے ہی تر کریں۔

شاہزادی کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے نہایت ہی اندوہگیں آواز سے جسکی دردناک کمزوری اس کے اپنے کانوں نے بھی محسوس کی۔ پوچھا "آخر خدا کی مخلوقات پر اتنا ظلم کیوں ہو رہا ہے، اور یہ کیسے کپڑے ہیں جن کو غم اور مصیبت کے ہاتھ تیار کر رہے ہیں"

بہت سی آوازوں سے ملی ہوئی ایک آواز جو اپنی کیفیت میں ایک پر درد چیخ سے مشابہ تھی اس دالان میں گونج گئی "تم کون ہو کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ ہماری شاہزادی کی شادی کے کپڑے ہیں؟ تم یقیناً ہم میں سے نہیں ہو"

شاہزادی نے ایک چیخ ماری اور آنکھیں کھول دیں۔

آئینے خانے میں بڑی بڑی قندیلیں اسی طرح روشن تھیں آئینے اسی طرح چمک رہے تھے۔ اور اس کی شادی کے کپڑے اسی طرح اس کے سامنے

درخشاں تھے۔ ہاں اب وہ یہ تمیز نہ کرسکی کہ آیا وہ کپڑے جو اس نے اپنے عالم خیال میں دیکھے تھے' ان کپڑوں کی مانند تھے۔ یا یہ ان کی مانند ہیں یا دونوں ایک ہی ہیں۔

خواصین چیخ کی آواز سن کر اندر بھاگیں۔ مگر جب تک وہ شاہزادی کے پاس پہنچیں۔ شہزادی ان بیش قیمت جواہرات سے مرصع' اُن سونے چاندی کی تاروں سے بنے ہوئے پارچات کو' ایک ایک کرکے' نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی ٹھوکروں سے ٹھکرا کر دور پھینک چکی تھی۔

(۳)

ابھی صبح کاذب' خاموش اور خفیہ خبر رسانوں کی طرح رات کی تاریک سلطنت میں آفتاب عالمتاب کی سنہری فوج کی ناگہاں آمد کی خبر پہنچا کر اس کے امن وامان کو درہم برہم کیا چاہتی تھی۔ کہ شاہی نقارچیوں نے شہنائیوں اور نفیریوں کے بلند مگر سریلے نغموں سے دنیا کو اس مبارک دن کی قربت کا مژدہ سنا دیا۔

شاہی مہمانوں کے خیمے' اس صبح امید کے طلوع کی خبر سنتے ہی زندگی اور روشنی کی حرارت سے لبریز ہو گئے۔ شاہزادی کی پسند کو شکار کرنے والے شکاری' جو رات بھر اپنی اپنی گھاتوں کی تجویز' اور اپنی نظر فریبوں کو کامیاب بنانے کی تدبیریں نیند سے بیزار رہے تھے' یہ پیغام بیداری سن کر ایک نئی بے چینی' ایک تازہ دم اضطراب سے بے قرار ہو گئے۔

ان میں خاور شاہ کا بیٹا ضیغم بھی' ایک دوسروں سے کم شان دار خیمے تھا۔ خاور شاہ' آرام شاہ کی ہمسایہ سلطنت کا تاج دار تھا۔ جس کی ہیبت الکہ دور دور کے فرماں رواؤں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ آرام شاہ شوکت کے باوجود اس کے علاقوں کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے ۔

کوئی پتھر اس کی ہوس ملک گیری کے راستے میں حائل ہُوا۔ تو وہ خاور شاہ کی ہیبت اور عجیب طاقت کا خوف تھا۔ خاور شاہ کا دربار شاہی شان و شوکت سے معرّا تھا۔ خاور شاہ کی سلطنت میں مجبوریت و محکومیت کا احساس ناپید تھا۔ خاور شاہ خود سادگی کا ایک زندہ پیکر تھا۔ اس کے دربار میں نہ کوئی تاج تھا نہ تخت، اس کے رہنے کے لئے نہ کوئی قصر تھا نہ محل۔ ملک کی حفاظت کے لئے اس کے پاس نہ کوئی لشکر تھا نہ سپاہ۔ شاہی وضعداری کے اظہار کے لئے اس کے پاس نہ کوئی درباری تھا نہ مصاحب۔ مگر خدا جانے کیا بات تھی۔ کہ اس کی رعایا اس کی مرضی سے ادب اور عزت، محبت اور اخلاص کی مضبوط زنجیروں کے ساتھ وابستہ تھی۔ جنگ و جدال کے وقت وہ امن پسند رعایا ایک وفادار اور جنگجو لشکر کی صورت میں تبدیل ہو جاتی تھی اور امن کے زمانے میں وہ سرفروش اور وحشی سپاہی ایک محنت کش اور مرنجاں مرنج آبادی کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔

اردگرد کے تاجدار خاور شاہ کو اور اس کی سلطنت کو کبھی لالچ اور حسرت سے کبھی غصہ اور نفرت سے کبھی تعجب اور حیرت سے دیکھتے تھے۔ مگر اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔

ضیغم ان باتوں میں اپنے باپ سے دو قدم آگے بڑھا ہُوا تھا۔ وہ ایک بے کار اور پرعشرت زندگی کے پیدائشی حقوق کے باوجود اپنے دارالسلطنت سے دور ایک چھوٹے گاؤں میں ایک غریب اور محنتی مزدور کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ اپنے مصارف کے لئے سے بھیک مانگنے کو اپنے قویٰ کی ذلت سمجھتا تھا اپنے اقتدار کے لئے تا زمنصب سے عزت کی دریوزہ گری کو اپنے اخلاق کی توہین تصور اور وہ معمولی سپاہیوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑا ہو کر لڑتا۔

کھیتوں میں معمولی کسانوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرتا۔

یہ ضیغم، یہ ایک بادشاہ کا مزدور بیٹا، شہزادی دلارام کے انتخاب کے معیار پر پورا اُترنے کے لئے نہیں بلکہ شہزادی دلارام کو اپنے انتخاب کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے آج آرام شاہ کے دارالسلطنت میں موجود تھا۔ مگر اس کی شخصیت کا علم اس کے سوائے کسی اور فرد واحد کو نہ تھا۔ وہ ایک پہلوان کی حیثیت سے آیا تھا۔ اور چونکہ اس سرزمین میں جسمانی طاقت، نسبی امتیاز سے کم رتبہ نہ رکھتی تھی۔ اسلئے اس کے مطالبہ پر کسی شخص کو اعتراض نہ ہوا۔ اس نے اپنے لئے خود ہی ایک خیمہ جو عام منظر سے ذرا دور ہٹ کر ایک گوشہ میں تھا منتخب کیا۔ اور دوران قیام میں نہ کسی سے ملا، نہ کسی کو اپنا حسب و نسب بتایا۔

وہ ایک عورت کی محبت کو حسب نسب کے امتیاز سے جیتنا نہ چاہتا تھا، وہ اس عورت کو جسے وہ عمر بھر کے لئے رنج و راحت کا شریک بنانا چاہتا تھا، موجودہ خوشحالی کا لالچ نہ دینا چاہتا تھا، اس لئے وہ اپنے جسم کی سفارش کے لئے لعل و جواہر سے مرصع لباس، پہن کر نہ آیا تھا، اپنے رہنے کی نمایش کے لئے خدم وحشم کو ہمرکاب نہ لایا تھا۔

اس کی آرزو تھی کہ وہ شادی کو ایک تجارتی مقصد بننے کی اجازت نہ دے۔ اس کی خواہش تھی۔ کہ ایک عورت اپنے شوہر کو صرف اس کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے انتخاب کی عزت بخشے۔ اس لئے اس نے اپنے قوی، سڈول، اور ورزشی جسم کو جو دن کی محنت اور رات کے آرام کی بدولت صحت و تندرستی کا ایک مجسمہ تھا، صرف اپنے پہاڑی علاقہ کی بھیڑوں کے سفید اور سیاہ چرم سے آراستہ کیا اور اس پر ایک بڑے گلدار شیر کی کھال کا لبادہ پہنا۔ اس کے مضبوط کمر بند میں سوائے ایک چمکتے ہوئے فولادی خنجر کے اور کوئی زیور نہ تھا۔

سورج کے نکلتے ہی سب مہمان بڑے تزک و احتشام سے شاہی میدان میں ایک زندہ، چمک دار اور متحرک ہلال کی صورت میں جمع ہو گئے۔

شہر کے منتظر اور شایق باشندے جنہوں نے خدا جانے کن مصیبتوں سے اس رات کی لمبی گھڑیاں کاٹی تھیں، اپنی شہزادی کی شادی کی قابل یادگار رسوم کو دیکھنے کے لئے پہلے ہی سے جوق در جوق میدان کے چاروں طرف صف بستہ کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک شخص کا اپنے لئے بہترین جگہ تلاش کرنے کا شوق اور اس شوق کو پورا کرنے کی کوشش کا نظارہ، ایک طلاطم خیز سمندر کی سرکش اور پرہیجان لہروں کی یاد دلاتا تھا۔

شاہزادی کے برآمد ہونے کا وقت ہو گیا۔ مگر ابھی تک منتظر آنکھوں کی پیاس نہ بجھی، اس دیر نے سمند شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ اور ہر شخص کی آنکھوں اور بے چین حرکتوں سے شہزادی کو دیکھنے کی تمنا ایک زندہ بیقراری بن کر ظاہر ہونے لگی۔

محلسرا کے دروازے کے باہر آرام شاہ خود اپنے بلند قامت ابلق گھوڑے پر سوار اپنے درباریوں اور مصاحبوں کے ساتھ شہزادی کا انتظار کر رہا تھا۔ اسکی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس کا دل ایک رہ رہ کے اُٹھنے والے درد سے بیقرار تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اس دیر کی گھڑیاں اور لمبی ہو جائیں۔ کیونکہ وہ اپنے دل کو اس احساس سے خالی نہ کر سکتا تھا کہ اس کی نور نظر آج محلسرائے سے نکلنے کے بعد اس حیثیت سے اس محلسرائے کے دروازے کے اندر پھر کبھی داخل نہ ہوگی۔ مگر کبھی کبھی وہ اُس بے جگر او ر مایوس جانباز کی طرح جو فتح اور شکست کے بغیر ہم وزن مواقع کو آزمانے کے لئے دشمنوں کی شمشیر بکف صفوں میں گھس جاتا بے صبری سے خواہشمند بھی ہو جاتا تھا۔ کہ شاہزادی جلدی برآمد ہو۔ اور جو

کچھ ہونا ہے ہو جائے۔

اور کبھی کبھی جب اس کو اپنی مغرور حیثیت، اپنی بیٹی کے حسنِ صورت و سیرت اور اس کے جہیز کی بیش قیمت اہمیت کا خیال آتا۔ تو اس کا چہرہ خوشی اور فخر سے تمتما اٹھتا۔ اور اس دیر کے ناقابل فہم راز سے بیقرار ہو کر اپنے قوی اور تنومند گھوڑے کے پٹھوں پر باہیں ٹیک کر سہارا لینے کے لئے پیچھے کو جھک جاتا۔

شاہزادی شہنائیوں اور نفیریوں کے شور سے بیدار ہو کر اٹھی۔ اسکی آنکھیں قابوس زدہ آنکھوں کی طرح وحشت ناک تھیں۔ اس کا چہرہ ایک آئینہ تھا جس پر اس کے دلی جذبات منعکس ہو رہے تھے۔ اس کا دماغ اس کے جسم کی طرح بیقرار اور اس کا دل ایک غیر معلوم تڑپ سے مضطرب تھا۔

خواصوں نے ڈر ڈر کر، گھبرا گھبرا کر، سہمگین نظروں اور مودب لفظوں سے اس صبح کی اہمیت اور مقررہ رسوم کی پابندی کی ضرورت کو جتایا۔ شہزادی اپنی قوت فیصلہ سے بیزار ہو کر کسی نامعلوم جذبے سے بے اختیار ہو کر چین بجبیں ہو گئی۔ یہ ان مودب کنیزوں کے لئے جن کی رائے کی آزادی، دوسروں کی مرضی کی پابندی کی عادی ہو چکی تھی۔ خاموش اور راضی بہ رضا ہونے کے لئے کافی اشارہ تھا۔ وہ سر جھکائے، زبان بے زبانی سے عفو تقصیر کی التجا کئے واپس ہو گئیں۔

دلارام نے اپنے قیمتی، اور جواہر نگار لباس کو ایک بار اور ایک غائر نظر سے دیکھا۔ اور پھر کسی یاد سے بے چین ہو کر ایک خشمگیں انداز سے اپنی آنکھیں ان چمکیلے کپڑوں سے ہٹا کر بند کر لیں۔

اب اس کے چہرے پر ایک عزم صمیم ظاہر تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور

چپ چاپ اپنے خلوت کے کمرے کی طرف چل دی۔ پھر بڑی احتیاط سے اس نے چمڑے کے ایک بٹوے سے ایک کنجی نکالی اور اس سے ایک مضبوط مگر پرانے آہنی صندوق کو کھولا۔ اور اس میں سے بڑے شوق سے ایک ایک کرکے ان کپڑوں کو نکالا۔ جن کو پہنے ہوئے وہ پہلے پہل محل سرائے میں داخل ہوئی تھی۔ اس میں شیر کی کھال کا وہ جامہ بھی تھا۔ جو اس دن اس کے بدن پر تھا جس دن آرام شاہ نے اس کو ایک پہاڑی چشمے کے پاس بھیڑیں چراتے دیکھا تھا۔

وہ ان کپڑوں کو ایک خاص تمکنت، ایک خاص ناز ایک خاص انداز سے اُٹھا کر آئینہ خانے میں لائی۔ اور کسی خواص کی مدد کے بغیر انہیں پہننا شروع کر دیا۔

پوستین پوش شاہزادی نے اپنے آپ کو ایک قدآدم آئینے میں دیکھا۔ اور اطمینان و مسرت کی ایک گہری سانس لی۔ پھر خود چل کر دروازے تک آئی۔ مگر جب اسکی منتظر اور مضطرب خواصوں نے اس کے بدن پر آرام شاہ کے زرق برق خلعت عروسی کے بجائے یہ دیہاتی، جنگلی، بے حیثیت کپڑے دیکھے۔ تو وہ ششدر ہو کر رہ گئیں

دلارام ان کا انتظار کئے بغیر، ان کی پرحسرت و استعجاب نظروں کی طرف توجہ دئے بغیر محلسرائے کے بیرونی دروازے کی طرف چلی۔ خواصوں نے اشاروں اشاروں میں ہی ایک دوسری سے دل کے خیالات ظاہر کئے۔ اور ایک بے آواز زبان سے آرام شاہ کی بیٹی کی رائے کی مخالفت کو ایک مہلک جسارت بتا کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیں۔

شاہزادی محلسرائے کی اندرونی ڈیوڑھی پر پہنچی۔ اور نقیب نے دعاے دولت کا نعرہ بلند کیا۔ فوراً بڑے بڑے مذہبی بزرگ اور منصب دار درباری جو اس کام کے لئے منتخب کئے گئے تھے۔ اس کے استقبال کے لئے اندر داخل ہوئے۔ مگر دلارام کو ایک جنگلی، وحشی، دیہاتی لڑکی کے لباس میں دیکھ کر حسرت۔ نفرت اور غصہ سے بھر گئے

ان میں سے سب سے زیادہ مشہور پارسا راہب نے جس کی دنیاداری ظاہری کوششوں کے باوجود نہ چھپ سکتی تھی۔ بڑھ کر شاہزادی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ دیکھ کر کہ دلارام ایک شان بے پروائی سے کسی رسمی تقریب کے بغیر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس نے بلند آواز سے جس کی گونج میں ایک زہریلے سانپ کی پھنکار ایک خونخوار بھیڑیئے کے دانتوں کی کچکچاہٹ ایک مردم خوار انسان کی حیوانیت جھلک رہی تھی کہا "آج بادشاہ کو اپنی شادی کی غلطی کا احساس ہوگا۔ ایک گڈریے کی بیٹی شہزادیاں پیدا نہیں کرسکتی۔" دلارام اس کی طرف نظر اٹھائے بغیر پہلے سے زیادہ بے پروائی، زیادہ استغنا، زیادہ سنجیدگی سے آگے بڑھ گئی۔ اور بیرونی دروازے کی دہلیز تک جا پہنچی۔

بادشاہ نے شہزادی کو، باپ نے بیٹی کو دیکھا۔ اور پھر اس طرح جس طرح ایک مجبور، مقہور بدقسمت اپنی طبیعت کو اپنی یقینی بدبختی کا استقبال کرنے پر رضامند کر لیتا ہے۔ اس نے اپنی پرنم نظروں کو زمین میں گاڑ کر کسی خوشی یا شادمانی کا اظہار کئے بغیر، شاہزادی کے بالگیروں کو گھوڑا بڑھانے کے لئے اشارہ کیا۔ شہزادی کسی کی مدد کا سہارا لئے بغیر اپنے سفید گلدار گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ آرام شاہ نے اپنے گھوڑے کو مہمیز سے خفیف سی ٹھوکر لگائی۔ گھوڑا اڑا۔ اور دم زدن میں بادشاہ اور اس کی اکلوتی بیٹی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار شاہی میدان کے مرکزی خلا میں آکر رک گئے۔

دلارام نے، ایک عورت کی باریک بین نظر سے اپنے طالبوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس کو ہر جواہر نگار لباس، ہر زریں تاج، ہر مرصع لبادے کے نیچے ایک عیش و عشرت کی زندگی سے برباد جوانی، شاہی تزک و احتشام سے مغرور

انسانیت، ظاہری نمائش سے لبریز بے سروسامانی نظر آ رہی تھی۔ ....

آرام شاہ کا دماغ بوڑھے راہب کے الفاظ کے زہر سے متاثر ہو رہا تھا۔ زروجواہر کی اس نظر فریب نمائش کا اپنی عزت کی ذلت، اپنے ارادوں کی ناکامی، اپنے مقصد کی فنا سے مقابلہ کر رہا تھا۔ کہ اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے سامنے کرۂ ہوا میں ایک ہوا سے زیادہ لطیف ہستی برسے ہوئے بادلوں کی سی شفاف کیفیت اختیار کرتی ہوئی دکھائی دی .... کیا اس کی نظر اسے دھوکا دے رہی تھی۔ یا وہ فی الواقعہ مرحوم بیگم کو آج اتنی مدت کے بعد پھر اس کی اپنی شکل و صورت میں اسی مادی دنیا کی فضا میں دلآرام پر خوشی، امن اور برکت کے پھول برساتے ہوئے دیکھ رہا تھا ـــــ

یہ منظر دیکھتے ہی اس کے چہرہ پر ایک غیر متوقع سکون، ایک غیر محدود اطمینان ایک غیر معلوم تبسم پیدا ہوا۔ اور اس نے دلآرام کے چہرے کی طرف دیکھا۔

چمکتے ہوئے سورج کی کرنیں اس کے صحیح خون پر منعکس ہو کر ایک لعل و جواہر سے زیادہ درخشاں روشنی پیدا کر رہی تھیں۔ دلآرام کے جسم کا تناسب، دلآرام کے چہرے کی تمتماہٹ اس کے سادہ لباس کو ایک عجیب حسن سے معمور کر رہی تھی۔ اس نے اردگرد کے شاندار منظر کو اپنی آنکھوں کے حلقوں میں محدود کیا۔ تو اس کو دلآرام اس طرح نظر آئی۔ جس طرح ایک صبیح اور شفاف چہرے پر ایک خوبصورت خال کھلتا ہے۔

دلآرام کی نظر ان زرپوش شہزادوں کے چہروں سے اچٹ کر ضیغم کے صحت مند جسم، سادہ لباس، اور عریاں حسن پر پڑی۔ اس کی نظر نے رگوں کے تاروں پر دماغ کو ایک خاموش برقی پیغام پہنچایا۔ جس کی حرارت اس کے دل نے محسوس

کی۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ ان بے شمار صورت فروشوں کے دل جنگی نگاہیں شاہزادی کے فیصلہ کو ایک مادی صورت میں دیکھنے کے لئے بیقرار تھیں دھڑکے مگر دلارام کا گھوڑا ان کی آراستہ صفوں سے گزرتا ہوا' سامنے کی زندہ اور متحرک دیواروں کے چکر کاٹتا ہوا ضیغم کے سامنے آکر ٹھیر گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں شہزادی کے ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اور وہ پھولوں کا ہار جو شہزادی کی گردن میں تھا۔ ضیغم کے کشادہ سینے سے ہم آغوش ہو گیا۔

ضیغم نے گھوڑے سے اُتر کر شاہزادی کی رکاب کو پکڑا۔ اس کے اپنی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور اسے اپنے مضبوط کلاوے میں لے کر گھوڑے سے اتارا پھر اپنے گھوڑے کی رکاب کو تھام کر اسے اس پر سوار کیا۔ اور خود ایک جست بھر کر اس کے آگے بیٹھ گیا۔ دلارام کے خوبصورت اور خمدار بازو اس کی کمر کے ارد گرد ایک درخشاں اور لچکدار کمر بند کی طرح لپٹ گئے۔

ضیغم کا گھوڑا' کسی ناقابل دریافت جس سے اپنے مالک کے ارادے کو تاڑ کر اپنے قیمتی سرمایہ کی اہمیت کو سمجھ کر' میدان کے مرکز کی طرف' بڑی سنجیدگی' بڑی سبک روی سے بڑھا اور آرام شاہ کے گھوڑے کے سامنے آکر اپنے مغرور سر کو بلند کر کے اپنے پاؤں کو ایک غیر متناہی رقص سے لرزاں کئے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

میدان میں مختلف جذبات سے بھری ہوئی آوازوں کا ایک غیر متناسب شور پیدا ہوا۔ چند لمحوں کے بعد صرف ایک مغرور' حاسد اور کینہ پرور آواز جو ایک سب سے زیادہ شاندار لباس پہنے ہوئے' شہزادے کے لبوں سے نکلی تھی سنائی دی۔

یہ بادشاہی امانت ایک بے نام و نشان وحشی پہلوان کے سپرد نہیں کی جا سکتی

ایک بے وقوف لڑکی کی رائے پر ایک سلطنت کی عزّت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

آرام شاہ کا تنومند جسم ان الفاظ کے تیز نشتروں سے زخمی ہو کر کانپا۔ مگر اس سے پیشتر کہ اس کی زبان کسی لفظ کو ترکیب دیتی اس کے کانوں نے ضیغم کی بلند اور پرشوکت آواز کو اس کھلی فضا میں گونجتے ہوئے سُنا۔

"خاور شاہ کے بیٹے ضیغم کا حسب و نسب صرف اس خنجر کی تیز زبان بتا سکتی ہے۔ آؤ اور اس سے پوچھو"

میدان میں سناٹا سا چھا گیا۔ مغرور گردنیں جھک گئیں۔ بڈھے راہب نے اپنے سر کو بغل میں چھپا لیا۔ خود پسند معترض شہزادے کے شرمندہ چہرے نے اپنے قریب کے سوار کی پیٹھ کی پناہ لی۔

آرام شاہ کے چہرے کی ابھری ہوئی رگوں میں خوشی اور کامیابی کی رو دوڑ گئی۔ اور پھر تماشائیوں کے قلزم میں ایک ہیجان، ایک شور پیدا ہوا۔

"خاور شاہ کا بیٹا ضیغم زندہ رہے"

شادی کی رسوم انجام کو پہنچ گئیں ضیغم اور دلارام نے آرام شاہ کے دئے ہوئے جہیز کے بے شمار اور بے بہا سامان کو دربار میں سجوایا۔ اور جب سب مہمان اور دیکھنے والے جمع ہو گئے، تو حکم دیا کہ یہ سب سامان شہر کی غریب آبادی میں تقسیم کر دیا جائے کہ ان کی محنت کی کمائی پر صرف انہی کا حق ہے۔ ......

اس وقت آرام شاہ نے اپنے تخت سے آہستہ آہستہ اُتر کر بیٹی کو گلے لگایا۔ اور پھر ضیغم اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ان کو یہ کہتے ہوئے تخت پر بٹھا دیا۔

"لو اس وسیع سلطنت کی رعایا کے حقوق کی پاسبانی تم سنبھالو کہ یہ تمہارا حق ہے"

(حسن کی قیمت)

نوشتۂ خونیں

(از سید عابد علی صاحب عابدؔ۔ بی۔ اے' ایل ایل۔ بی' وکیل)

(۱)

یہ میری آخری تحریر ہے لیکن اس داستانِ غم۔ اس افسانۂ شوق کے بیان سے ہذیاناتِ عشق کی رسوائیوں کا نشر مقصود نہیں۔ بلکہ اپنی زندگی کے اس روح فرسا بابِ آخرین کی بے نقابی سے صرف یہ مدِ نظر ہے۔ کہ میرے ساتھ انجمن آرا کے جو تعلقات تھے اُنہیں اپنے حقیقی رنگ میں پیش کیا جائے۔ مَیں اپنے عمیق حسّیات کی ایک جھلک دکھانا بھی گوارا نہ کرتا۔ اگر مجھے اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ میری شاعری انجمن آرا کے خونِ عزّت سے آلودہ ہو کر۔ نہیں بلکہ جِلا پا کر مستقبل کی فضا میں جا پُہنچیگی لوگ کہیں گے انور نے انجمن آرا سے محبت کی اپنے چچیرے بھائی کی بیوی سے محبت کی۔ محبت جرم نہیں۔ لیکن "لوگوں کے زاویۂ نگاہ"! آہ اُن لوگوں کے زاویۂ نگاہ!! جنہوں نے کبھی محبت نہیں کی۔ جو کبھی اُس مقدس جذبے سے متاثر نہیں ہوئے جس کی تاثیر ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان بنا دیتی ہے۔ جو ہر واقعہ کو اپنے حذا کی رنگین عینکوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ محبت کی ہر کیفیت پر

ہیں۔ ہوس کی ہر حالت کو محبت سمجھتے ہیں۔
اپنی ذات سے مجھے ان باتوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں۔ شام کے جھٹپٹے میں جب کائنات ظلمت و نور سے کاڑھا ہوا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اُس وقت شاعر کے دِل کی تاریکیوں میں اُس کے جذبات کی گہرائیوں میں آرزو کی شمعیں جھلکتی ہیں۔ الہام کے دیئے جلتے ہیں۔ صبح صادق کے وقت ڈوبتے ہوئے تاروں کی اداسی میں اُفق کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُس کا کیفیات سے لبریز دل کائنات کی دلچسپیوں کا محبوبوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے جسم مادی کی کثافت کو یہیں چھوڑ کر تخیّل کے شفاف پروں پر سوار ہو کر فطرت کی رُوح میں فطرت کے دل میں مل جاتا ہے وہ حقیقت کے آفتاب کو اپنے پہلو میں منعکس دیکھتا ہے اور محبت کرتا ہے۔ جس شخص کو یہ نعمتیں میسر ہوں اُسے دنیا کی زبان سے کوئی ہراس نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں مجھے کوئی خوف نہ ہوتا۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ نوشتہ عنوین محض انجمن آرا کی بے قصوری کو مظلومی کو واضح کرنے کے لئے رقم کیا جا رہا ہے۔ بیشک مجھے اس سے محبت تھی۔ اس طرح محبت تھی۔ جس طرح صرف ایک شاعر کو ہو سکتی ہے دُنیا بھر کی رنگینیاں میرے لئے اُس پیکرِ مادی میں منتقل ہو گئی تھی۔ کائنات۔ بہار، پھول، موسیقی، عطر، فطرت، قدرت سب کچھ انجمن آرا سے ہم آغوش تھے۔ اور انجمن آرا میری رُوح سے ہم آغوش تھی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے والے ستاروں کی طرح میرے دل میں مُسکراتی تھیں۔ اور میری دُنیائے دِل کا ذرہ ذرہ عشرت کے ایک رقص پیہم عشرت کے ایک احساس وارفتہ سے مُسکراتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں احساس ہوتا گویا وہ میرے دل میں بیٹھی آنسو بہا رہی ہے اور پھر میں بھی روتا۔ لیکن اُس رونے میں کوئی تکلیف نہ ہوتی تھا جس میں ٹیس نہ تھی یہ وہ زخم تھا جس کا اندمال تو محال تھا۔ لیکن

جس کا رسنا کوئی اذیت پیدا نہ کر سکتا تھا۔ مجھے انجمن آرا سے اس طرح کی محبت تھی ہاں اس طرح کی محبت تھی۔

لیکن وقت قریب ہے۔ زہر اپنا پورا اثر کر چکا۔ میری آنکھیں جھلملا رہی ہیں آہ دور۔ بہت دور گنجان درختوں کا ایک جھنڈ نظر آرہا ہے۔ میری کھڑکی میں سے اُن کا صرف ایک تھوڑا سا حصہ نظر آتا ہے۔ سایہ اُوس کا ہیبت ناک سایہ اُن پر چھا گیا ہے۔ اُسی طرح چھا گیا ہے۔ جس طرح میری رُوح پر موت کے قدموں کی تاریک چاپ چھا گئی ہے۔ وہاں چند پھول بھی کھلے ہیں۔ رنگوں میں تمیز تو نہیں کیجا سکتی لیکن سُرخ رنگ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ سُرخ! خدا جانے کس کس کی عشرت کے خُون سے سُرخ وہ کیا "صورتیں" تھیں؛ جن کا خاک میں پنہاں ہونا گل طرازی کر رہا ہے۔ موت۔ موت بھی ان سُرخ پھولوں کی طرح مجھے دُور سے خوشنما معلوم ہو رہی ہے۔ خُدا جانے مر کر وصالِ جاوداں کا امکان ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے کم از کم یہ تو تسلی ہے کہ جس حالت میں انجمن آرا ہے۔ اُسی حالت میں مَیں ہونگا۔ آہ اس دُنیا سے شعر کہتے ہوئے اٹھ جانا کس قدر لطیف ہوتا ہے لیکن خود ایک پُر درد شعر بن کر صفحۂ ہستی سے مٹ جانا اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اب میری رُوح کی شعریت تشنہ کام نہ رہیگی۔ لا متناہی فضا میں پرواز کرتے ہوئے مَیں یقیناً اپنے تخیل کی کشش سے انجمن آرا کی رُوح کو مقناطیسی جاذبیت سے اپنی طرف کھینچونگا۔ اور پھر ترنم اور تبسم کا اجتماع ہوگا۔ مَیں پھر دُور جا پڑا۔ ضروری ہے کہ اس داستان کو اختتام تک بچانے کے لئے مَیں ابتدا سے انتہا تک واقعات کو ایک مسلسل طریقے میں پیش کروں۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میرے لئے اس واقعہ کی ابتدا یا انتہا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ گزرے ہوئے تمام میرے لئے ایک واقعہ ہیں۔ ایک دن ہیں۔ ایک لمحہ ہیں۔ اور آہ

افسانہ کی ابتدا میں تھوڑی سی تمہید ضروری ہے

سے بے نیاز شاعر کی محبت زیادہ نہیں ہو سکتی۔ کم نہیں ہو سکتی۔ مٹ نہیں سکتی۔ اُس کی زندگی شاعری ہے اور شاعری محبت۔ بس بہت ہو چکا آیندہ سطور مسلسل نہ ہوں تو نہ ہوں۔ لیکن حقیقت ہونگی۔ اِسلئے دلگداز ہونگی۔

(۲)

وہ پہلے پہل ایک رنگین تیتری کی طرح معصومیت کے ایک کیف رقصاں میں سرشار میری زندگی میں داخل ہوئی۔ میری دُنیائے دل کے دروازے آغوشِ انتظار کی طرح وا تھے۔ وہ اس مملکت میں داخل ہوئی۔ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ اقلیم تاثر کی ہر صورت احساس کی ہر حالت کے لئے بند ہو گئی۔ وہ میرے چچیرے بھائی نثار کے ساتھ اس ناقابلِ فہم رشتے میں منسلک ہو کر آئی تھی۔ جو انتہائے قرب کے باوجود خلوص پیدا نہیں کر سکتا۔ کمالِ انصال کے ساتھ بھی حقیقی اشتراک کی تخلیق کا ضامن نہیں۔ نثار اُسے بیاہ لایا تھا۔ مَیں نے اسے پہلے پہلے کس طرح اور کس رنگ میں دیکھا۔ یہ ایک بہت عجیب سوال ہے۔ کیونکہ اُسے دیکھنے سے پیشتر میرے دل میں ایک رنگین تصوّر موجود تھا۔ جس کی مَیں پرستش کرتا تھا۔ انجمن آرا کو دیکھ کر اُس تصوّر کی رنگینیاں جاگ اُٹھیں۔ رُوح نے جسم کا قالب اختیار کر لیا۔ مَیں نے جی بھر کے اُس کی طرف کبھی نہیں دیکھا۔ میرے حافظہ میں اُس کی یاد اس طرح محفوظ ہے۔ کہ ایک شعلہ عریاں نے شرمیلی لجیلی صورت اختیار کر لی ہو۔ دن بھر وہ ہوا سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی میری نگاہوں کے سامنے سے تڑپ کر گزر جایا کرتی تھی۔ آہ وہ کسقدر شادمان تھی، کسقدر مسرور تھی۔ ایک دن مَیں نے اُسے دیکھا کہ وہ آئینے کے سامنے بال بنا رہی تھی۔ کمر تک بل کھاتی ہوئی سیاہ مشک بو لٹیں، پاؤں میں کٹ سلیپر۔ وہ خود اپنی نگاہوں سے اُن نگاہوں سے جن میں نثار کی آرزوئیں تھا۔ شرمائے جاتی تھی۔ اُس نے ہلکے سبز رنگ کی ایک شلوار

پہن رکھی تھی۔ اتفاق سے جب اُس کے ہاتھوں سے کنگھی چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ تو وہ اُسے اُٹھانے کے لئے جھکی۔ جھکنے میں اُس کا پاؤں شلوار کے پائینچے میں پھنس گیا۔ اور اُس نے اپنی کمر کو ایسا نازک لوچ دیکر پائینچے میں سے پاؤں نکالا۔ کہ مجھے خوف آنے لگا۔ کہ یہ نور اور گداز کے خمیر سے گندھی ہوئی پتلی تکلیف کے احساس سے پگھل کر نہ رہ جائے۔ مجھ سے اُس کی باتیں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ نثار کی محبت یا وہ جذبہ جسے وُہ اُس وقت محبت سے تعبیر کرتی تھی۔ اس پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ وہ بمشکل کسی اور چیز کے لئے وقت نکال سکتی تھی۔ اور نثار ہوس کا پرستار نثار وہ بائیس تیئس برس کا جوان تھا۔ خوبصورت، شاید عورتیں اُسے بہت خوبصورت کہتی ہوں گھنی مونچھیں۔ بلند پیشانی۔ چندیا کے بال نسبتاً کم تھے لیکن باقیماندہ بال معمولی گھونگریالے تھے لباس پہننے میں لطافت تو کوئی نہیں برتتا تھا لیکن لباس اُسے پھبت ضرور جاتا تھا۔ گہری ہوس انگیز آنکھیں۔ شعر کہنے کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت مجھ سے داد کی توقع رکھتا تھا۔ شادی سے پیشتر وہ بہت عیاش رہ چکا تھا۔ اکثر وہ ایک فخریہ انداز میں ایک مصنوعی شرمگیں تبسم کے ساتھ اپنے دورِ تعیش کے افسانے سنایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے ایک ناول بھی لکھنا شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ اختتام تک نہ پہنچا۔ ورنہ وہ صحیفۂ سیاہ کاری بہت سے تماشبینوں کے لئے رہبری کا کام دیتا۔ میرا خیال تھا کہ شادی کرنے کے باوجود اُس کی طبیعت میں کوئی اختلاف واقع نہ ہوگا۔ لیکن پہلے ایک دو سال اُس نے واقعی سر سر انجمن آرا کی محبت کی نذر چڑھا دیئے۔ اُن پہلے دو سالوں میں وہ انجمن آرا کے سوا دُنیا کی ہر شے کو فراموش کر بیٹھا۔ حتےٰ کہ مجھے بھی اس بات کا یقین ہونے لگا۔ کہ شاید اسکی عادتیں سُدھر جائینگی لیکن معلوم ہوا کہ یہ سکون اُس عارضی اور خطرناک جمود سے مشابہ تھا۔ جو خوفناک آندھیوں کے جھکڑ سے پیشتر دنیا پر طاری ہوتا ہے۔ اُس سبب خاموش

کی طرح تھا۔ جو باد یا طوفان بپا ہونے سے پیشتر دریا کی رواں سطح پر ہلکورے لیتی ہے۔ غرضیکہ وہ بہت مسرور تھے۔ بچوں کی طرح وہ اپنی عشرت کے موجودہ احساس میں ماضی کی ہر دردناک یاد کو مستقبل کی ہر روح فرسا توقع کو غرق کرنا چاہتے تھے میں چاہتا تھا ان حالات پر یقین کروں لیکن میرے دل میں کوئی آواز کہتی تھی۔ نادان! نادان!! نادان!!! آخر وہ دن آپہنچا۔ مجھے احساس ہوا۔ نہیں میرے محبت کے لطیف ادراک کو الہام ہوا۔ کہ نثار انجمن آرا سے اُکتا گیا۔ اب انجمن آرا کی آنکھوں میں وہ اگلی سی چمک نہ رہی تھی۔ اُن آبگینوں میں شبہات کے زہر نے مطمئن شوخیوں کو مکدر کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے خوب غور سے دیکھا۔ کہ اُسکی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اس کا سبب دریافت ہونے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ اُس سے دوسرے دن ہی رات کو نثار میرے پاس آیا۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور انمیں ہلکے ہلکے ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔

اُس نے میرے قریب آکر میرے شانے پر تھپکی دی اور کہنے لگا۔ "انور"

میں نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔

اُس نے فلسفیانہ فوقیت کے انداز میں کہا "تم کسی دن پڑھ پڑھ کے پاگل ہو جاؤ گے"

میں خاموش رہا۔ کیا جواب دیتا۔ وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا "آؤ چلیں تم شاعر ہو۔ جذبات کا مطالعہ بھی کیا کرو۔ آؤ میں تمہیں اپنی محبوبہ کے ہاں لے چلتا ہوں، تمنے کسی عورت کو محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا ہوگا۔ آج میں تمہیں دکھاؤنگا"

مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں غرق ہوتا چلا جا رہا

ہوں۔ ڈوبتا چلا جا رہا ہوں نیچے نیچے۔ نیچے مجھے غش سا آنے لگا۔ بیچاری انجمن آرا۔ مظلوم انجمن آرا۔ یہ وہی نثار تھا جس کے لئے انجمن آرا جیتی تھی۔ جس کو دیکھ دیکھ کر وہ اپنی زندگی کی گھڑیاں کاٹتی تھی۔

مَیں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا اور لفظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے " اور ـــــ اور انجمن آرا؟" اُس نے میری طرف پریشان تعجب سے دیکھا۔ گویا سوچ رہا تھا کہ مجھے انجمن آرا سے یہ ہمدردی کیوں ہے۔ پھر میرے نحیف جسم کی طرف زرد چہرے کی طرف دیکھ کر اُس کے لبوں پر ایک مطمئن تبسم کھیلنے لگا۔ بیشک وہ درست سمجھا تھا۔ میرا اور انجمن آرا کا واسطہ ہی کیا۔ آخر کار کہنے لگا " یہ ہمدردی یہ نصیحت کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھو۔ انجمن آرا اپنی جگہ ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔"

مَیں فوری جذبات سے متاثر ہو کر کافی سزا پا چکا تھا۔ اب مَیں نے ذرا سنبھل کر کہا " بیشک۔ لیکن مَیں کہیں نہیں جاؤنگا۔"

"کیوں"

"نہیں جاتا"

اُس نے پھر زیادہ زور دیکر کہا " ایک دفعہ چلو انور صرف ایک دفعہ وہ ایک طوائف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن بہت مہذب، بہت شگفتہ رُو اور پھر اُسے مجھ سے محبّت ہے۔ مَیں اس عیش کے بوجھ کو اکیلا برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔ سُنتے ہو جانا ہوگا۔ تمہیں میرے انتخاب اور اُس کی محبّت کی داد دینا ہوگی۔"

میرے دل میں آیا کہ مَیں اُسے جھڑک دُوں۔ مَیں یہ لفظ کہنے ہی والا تھا کہ مَیں ہرگز نہیں جاؤنگا۔ کہ یکایک میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی سرعت سے چمکا۔ اور مجھے مبہوت و ششدر بنا گیا۔ مَیں سوچ رہا تھا۔ کہ محبّت کوئی اختیاری چیز نہیں

مجھے انجمن آرا سے محبت تھی تو اس کے یہ معنی کہاں نکلتے ہیں۔ کہ نثار بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ ممکن ہے نثار کو اس طوائف سے اسی طرح محبت ہو جس طرح مجھے انجمن آرا سے محبت تھی۔ اس بات کو یقین تک پہنچانے کے لئے میں بیتاب ہو گیا۔

تھوڑی دیر ٹھہر کر میں نے ظاہری بے پروائی سے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں لیکن زیادہ دیر نہیں ٹھہرنے کا۔"

وہ فرطِ مسرت سے اچھل پڑا۔ "آدھ گھنٹہ صرف آدھ گھنٹہ۔ میں اس کے سامنے بے زبان ہو جاتا ہوں تم میری ترجمانی کرنا۔ کاش تمہارے جیسی فصاحت مجھے بھی عطا ہوئی ہوتی۔"

"اور مجھ جیسا نحیف جسم"

وہ مسکرایا پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا اور کہنے لگا۔ "چلو چلیں۔"

ہم دونوں چل نکلے۔ وہ بہت بیتابی سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ گویا جلد تر منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے۔ آخر کار وہ ایک تنگ و تاریک مکان میں داخل ہوا۔ دالان سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں جا پہنچے۔ دیواروں پر معمولی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے کتنی اخباروں سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔ زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ لیکن ایک کونے میں ایک چھوٹی سی سفید چادر دری کی بوسیدگی کی پردہ پوشی کر رہی تھی۔ ایک طرف پیکدان الٹا پڑا تھا۔ جس میں سے پیک بہ بہ کر فرش پر مکھیوں کے ہجوم کو دعوت دے رہی تھی۔ لیکن ان تمام مکروہ چیزوں سے زیادہ مکروہ اس تمام ڈراؤنی فضا کو اور زیادہ بھیانک بنانے والی چیز کمرے میں ایک طرف ایک غیر معمولی صاف اور ستھرے پلنگ پر ایک عجیب عریاں انداز میں سو رہی تھی۔ مجھے بیک نظر دیکھنے کے بعد اس سے سخت نفرت ہو گئی۔ یہی وہ عورت تھی، جو انجمن آرا کی جگہ نثار کی مسندِ دل پر

جا بیٹھی تھی۔ نثار اُس کے قریب جا کر اُسے جگانے لگا۔ پہلے اُس کے تلوے گدگداتا رہا۔ پھر اس کا سر دونوں ہاتھوں میں لیکر دبانے لگا۔ اب وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ پان کی پیک باچھوں تک آئی ہوئی تھی۔ وہ نثار کو دیکھ کر ایک عجیب مضمحل انداز میں مُسکرائی اب اُس نے مجھے بھی نثار کے پیچھے کھڑا ہؤا دیکھا پہلے چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں میں نے منہ پھیر لیا۔ نثار بھی اُسے میری موجودگی میں ایسی حالت میں دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ ذرا ترش آواز میں بولا "اُٹھو مُنہ ہاتھ دھو آؤ"

وہ ایک بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ کپڑوں کو سنبھالتی ہوئی اُٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا بوئے فحش کا ایک دریا میری طرف بڑھتا ہؤا چلا آرہا ہے۔ وہ اندر کے ایک کمرے کی طرف جانے لگی۔ دہلیز پر کھڑا ہو کر اُس نے مُڑ کر پھر میری طرف دیکھا۔ اور میں خُدا جانے کیوں مُسکرا دیا۔ وہ خود بھی مُسکرا کر اندر چلی گئی۔ اب میں یہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی باتیں سُننے کا اشتیاق اور اُن باتوں سے یہ نتیجہ نکالنے کی خواہش کہ آیا اُسے واقعی نثار سے محبت ہے یا نہیں مجھے روک رہی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ مُنہ ہاتھ دھو کر اور لباس تبدیل کر کے واپس آگئی۔ لیکن میں نے اُس کی حالت میں کسی نمایاں تفاوت کا احساس نہیں کیا۔ پہلے اگر اس کے انداز سے وحشت خیز پریشانی برستی تھی تو اب اُس کی جگہ ہوس انگیز عریانی نے لے لی تھی۔ اُس نے گہرے سُرخ رنگ کا ایک فراک پہنا ہؤا تھا۔ بال انگریزی طریق سے بنا رکھے تھے۔ لیکن کلپ اس بھونڈے تناسب سے لگا رکھے تھے۔ کہ بہ ہیئت مجموعی کوئی خوشگوار اثر مترتب نہ ہو سکتا تھا۔

نثار نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ میرے چچیرے بھائی ہیں۔ انور صاحب ان کا نام تو آپ سُن چکی ہونگی۔ ظالم شعر بہت اچھے کہتا ہے۔ ہاں انور کیسے ذرا وہ

سُنانا تو ہے

آغاز آرزو کی جو یاد آگئی ہنسی ..... آنسو ـــ آگے کیا۔ مَیں نے ذرا کرختگی سے کہا "کبھی پھر سہی"

نثار نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر ایک محجوب سے انداز میں اُس کے بالکل قریب جا بیٹھا۔

مَیں نے محض اس لئے کہ کچھ نہ کچھ کہنا میرا فرض تھا۔ نہ اس لئے کہ مَیں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ذرا سرد مہری سے کہا "مجھے تو آپ نے ان کے نام سے ابھی تک مطلع نہیں کیا"

نثار جواب نشے میں بالکل سرشار ہو چلا تھا۔ اور جس کی آنکھیں اُس حسن فروش خبیث انداز ہستی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ذرا چونکا۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ان کا نام اس قتالہ۔ عالم اس حسین کافرہ کا نام۔ ہاں ٹھیک ہے مَیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ اور نہ سُن سکو گے کس قدر حسین نام ہے! اسکا نام عنایت ہے"

عنایت! توبہ! مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ واقعی حسین ہوتی تو شاید یہ نام بھی شخصیت سے کسبِ حسن کرتا اور حسین ہو جاتا۔ لیکن اس صورت میں تو اس کا نام اس کی صورت سے زیادہ مکروہ تھا۔ یا شاید اسکی صورت اُس کے نام سے زیادہ مکروہ تھی۔

عنایت نے میری طرف دیکھا۔ کشادہ۔ سیاہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور اپنی سیاہ پتلیوں کی ہر حرکت سے اپنے گنجان ابروؤں کی ہر جنبش سے مجھے وہی پیغام دینے لگی جو پہلے خدا جانے کتنے اشخاص کو دیا جا چکا تھا۔ ہر چند کہ میں اُسکی طرف دیکھتا رہا لیکن مجھے احساس ہؤا کہ اُس نے میری آنکھوں میں پسندیدگی کی کوئی چمک نہیں دیکھی۔ کیونکہ اُس نے بے نیازی کی ایک مخصوص ادا سے

اپنی گردن کو خم دیکے گویا میری موجودگی کے خیال کو اپنے ذہن سے یکسر دُور کر کے نثار سے ایک ایسے لہجے میں جس میں بے تکلفی اور ناراضگی کے عنصر ملے ہوئے تھے۔سوال کیا۔ "نثار تم وہ ساڑی نہیں لاتے۔"

"ساڑی"

اس طرح گویا نثار کو ابھی کوئی بات یاد آئی ہے۔اُس نے اپنے دماغ پر جسکی قوتیں شراب کے زیر اثر کچھ معطّل ہو چلی تھیں۔زور دینے کی کوشش کی "یہ بات میرے ذہن سے بالکل اُتر ہی گئی۔"

یہ فقرہ اس انداز میں ادا ہوا تھا۔گویا وہ انتہائے انکسار سے اپنی فراموشی کو بھی قصوردار سمجھ کر خواہانِ عفو تھا۔

"مَیں نے تمہیں اتنی دفعہ کہا۔شالا مار کا میلہ نزدیک آتا جا رہا ہے سوچتی ہوں وہاں کیا پہنکر جاؤنگی۔"

"لیکن عنایت اُس دن تم نے تو میرے ساتھ جانے کا وعدہ کیا ہے۔"

مجھے افسوس ہے کہ مَیں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکتی۔"

نثار نے بہت بے صبری سے کہا۔ "یہ کیوں"

وہ چپ رہی۔نثار کچھ افسردہ سا ہو گیا۔نشے کے وفور میں بھی محبّت کا نازک احساس عنایت کے الفاظ کے معنی بین السطور کو پڑھ سکتا تھا۔اچھی طرح پڑھ سکتا تھا۔لیکن عنایت دانا تھی۔اُس کی خود غرض زیرکی جو شروع سے ہوس زر کی آغوش میں پال پوس کر جوان کی گئی تھی اور جس کو آرزوؤں اور اُمنگوں کے خون نے سینچا تھا۔اُسے یہ حقیقت سمجھا رہی تھی۔کہ جس طرح بعض وقت غنیم کو شکست دینے کے لئے ایک مدبر جرنیل غنیم کی فوجوں میں گھُس کر بھی عارضی طور پر واپس لوٹ آتا ہے۔تاکہ دھوکے سے بے خبری کے عالم میں ایک کاری حملہ کیا جائے۔اسی

طرح ایک عورت کو بھی بہت دیر تک اعتبارِ تمنّا کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ اُس نے نثار کی گردن میں ہاتھ ڈال دئے اور کہا "تم آج چپ چپ سے کیوں ہو" نثار کی تمام خود فریب آرزوئیں پھر جاگ اُٹھیں۔ اُس کی آنکھوں میں مسرتِ قلب کی ایک آتشیں رو چمک اُٹھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح باطل تاویلوں سے عنایت کی گزشتہ باتوں اور اُس کے موجودہ پیار کے تضاد کو اپنی محبت میں کم کرے۔ فنا کر دے۔ لیکن وہ اب تقریباً مخمور ہو چلا تھا۔ اس کا دل و دماغ اس کے قابو میں نہ تھے۔ اُس نے عنایت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اُس پر بوسوں کی بارش شروع کر دی۔

عنایت نے کہا "ذرا سنبھل کر بیٹھو۔ تمہارے بھائی کیا کہتے ہونگے"
پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولی "آپ نے تو ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی"
مَیں نے ایک مصنوعی تبسم میں اپنے دل کی کیفیات کو چھپانے کی ناکام کوشش کی "بات کیا کرتا محبت کی موجودگی میں عزیز سے عزیز محبوب سے محبوب شے بھی مخل ثابت ہوتی ہے"

اُس نے بغیر شرمانے کے کہا "کچھ اپنے شعر سنائیے"
مَیں نے چند ایک عذر لنگ پیش کئے۔ جنہیں وہ بھی سمجھ گئی۔ دس پندرہ منٹ تک اسی طرح کی معمولی رسمی باتیں کر کے مَیں رخصت ہوا۔

(۴)

واقعات کے اس پے در پے ہجوم نے میرے حواس کو مختل کر دیا۔ مَیں جتنا عرصہ عنایت کے ہاں بیٹھا رہا۔ اپنے آپ پر ضبط کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ لیکن باہر آتے ہی وہ تمام جذبات جو رسمی تہذیب کے بوجھ میں دبے ہوئے انگاروں کی طرح سلگ رہے تھے۔ بے پناہ آگ کی طرح بھڑک اُٹھے۔ مَیں کہہ چکا ہوں کہ مجھے انجمن آرا سے

کس طرح کی محبت تھی۔ ایسی محبت جو محبوب کی رضامندی کو مقدم سمجھتی ہے۔ جو اس کی عشرت میں اپنی عشرت کو اس کی خوشی میں اپنی خوشی کو تحلیل کرنا چاہتی ہے مختصراً ایسی محبت جو محبوب کو حاصل نہیں کر سکتی تو خود محبوب کے لئے وقف ہو جاتی ہے نثار کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اُسی قدر صدمہ ہوا جس قدر انجمن آرا کو ہو سکتا تھا۔ آہ لیکن فطرت بے رحم۔ سنگدل۔ درد آشنا۔ فطرت ابھی میرے لئے ایک اور سامانِ جراحت بہم پہنچا رہی تھی۔ میں گھر پہنچا تو اپنے کمرے میں انجمن آرا کو بیٹھے ہوئے پایا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہوئے اس پیکر کو واہمے کی تخلیق سمجھا میں نے کوشش کی کہ میں انجمن آرا کی صورت کو اپنے ذہن کی ایک خیالی تصویر سمجھوں اُف وہ کسقدر حسین تھی۔ کس قدر معصوم تھی۔ اُس کا چہرہ پژمردہ تھا۔ اور گالوں پر تازہ آنسوؤں کے نشان تھے۔ لب خشک ہو رہے تھے اُس نے میری طرف دیکھا اور مجھے یوں معلوم ہوا گویا اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں چمکتے ہوئے ستاروں کی ایک جھلک دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے دماغ کو اپنے دل کو ایک مافوق الفطرت قوت ضبط سے قابو میں لا کر رسمی لہجے میں پوچھا مگر مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کہ میری آواز بھرائی ہوئی تھی "انجمن آرا تم یہاں کیسے بیٹھی ہو" وہ بے اختیار رونے لگی۔ اُس وقت اگر میں اپنی تمام طاقتوں سے کام نہ لیتا تو ممکن تھا کہ میں خود بھی دیوانہ وار رونے لگ جاتا۔ میں چپ رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس وقت میرے لئے اُس کے جسم کے کسی حصے کو مس کرنا آگ سے کھیلنا ہوگا

میں نے پھر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

"آپ ابھی کہاں گئے تھے؟"

یہ بات تھی۔ اُسے بھی کچھ شبہ پیدا ہو چلا تھا۔ ٹھیک ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ نثار کی کارروائیاں اُس سے بہت دیر پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔

میں نے جواب دیا "ذرا باہر چلا گیا تھا۔"

"آپ کے ساتھ وہ بھی گئے تھے؟"

"نثار ہاں وہ بھی میرے ساتھ تھا" لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں اُس کے سامنے جھوٹ نہ بول سکتا تھا۔

"آپ کس جگہ گئے تھے"

"ایک دوست کے ہاں"

اب تک وہ خطرناک سکون سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ میرا پہلا جھوٹ سُنکر برافروختہ ہوگئی۔ اُس نے جوش میں آکر کہا "آپ بھی مجھے دھوکا دیتے ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہ سمجھتی تھی۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا۔ کہ وہ ایک طوائف کے ہاں جاتے ہیں۔ اور ......"

اس کے چہرے پر محض اس تصور سے محض اس خیال سے کہ نثار ایک حُسن فروش طوائف سے محبت کرتا ہے۔ شرم کی سُرخی دوڑ گئی۔

"میں اپنے آپ کو کس قدر ذلیل محسوس کرتی ہوں۔ کاش آپ سمجھتے۔"

میں اس غیرارادی تیر کے درد سے اس بے پناہ طعنے کی سوزش سے بیتاب ہوگیا میں نے جذبات سے لبریز آواز میں جواب دیا "میں سمجھتا ہوں اور خوب سمجھتا ہوں۔"

وہ اس غیر متوقع جوش کے اظہار سے پریشان ہوگئی۔ لیکن اپنی کیفیات کی فراوانی اسے بہت جلد میری موجودہ حالت کے احساس سے دُور لے گئی۔

"پھر آپ مجھے بتلاتے کیوں نہیں؟"

"میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بیشک نثار ایک طوائف کے ہاں گیا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا۔ مجھے کھینچکر ساتھ لے گیا۔

اُس نے بے اعتباری کے لہجے میں جس کے ہر لفظ سے حقارت برس رہی

تھی۔" کیا وہ آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو لے گئے۔"

مَیں نے کہا۔" ہاں"

وہ پھر رونے لگی۔ میرے اللہ یہ ناقابلِ برداشت تھا خدا جانے وہ کتنا عرصہ روتی رہی۔ میں خود رو رہا تھا۔ اگرچہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ لیکن دل خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔ انجمن آرا نے ہچکیاں لیتے ہُوئے کہا۔" آپ بھی مَیں سمجھتی تھی کہ آپ ایسے موقع پر میری مدد کرینگے۔ لیکن میری امید اس......"

اُس کی آواز ہچکیوں کے پیہم وفور میں غائب ہوگئی۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا مَیں اُن سے پُوچھتا ہوں جو دل کے گداز اور رُوح کے درد سے واقف ہیں۔ میرا روئے سخن اُن کی طرف نہیں جنہوں نے اپنی عمریں اس دُنیا میں ایسے فرسودہ تسلسل سے گزار دی ہیں۔ کہ خود اُن کی گہرائیوں میں خود اُن کے دل کے گوشوں میں اُنہیں اپنی طرف سے حقارت کا ایک احساس نفرت کا ایک جذبہ معلوم ہوتا ہوگا۔ کہ اُس وقت کیا کوئی شخص استقلال اور ضبط کو قائم رکھ سکتا تھا مَیں نے ضبط کی ہزار کوشش کی ظاہر میں خاموش تھا۔ لیکن میری رُوح میں ایک ایسا طوفان بپا تھا جس کی خوفناک کشمکش کو میں بہت عرصہ برداشت نہ کرسکتا تھا۔ میرے پاس اُس کے الزامات کی تردید میں صرف ایک جواب تھا ایک ثبوت تھا۔ لیکن مَیں جانتا تھا۔ کہ اُس جواب کا پیش کرنا اُس ثبوت کا بہم پُہنچانا نہ صرف میرے لئے بلکہ انجمن آرا کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ مضر نکلیگا۔

وہ اُٹھ کر جانے لگی۔ مَیں نے کہا۔" انجمن آرا"

اُس وقت اُس نے میری آواز میں پہلی دفعہ ٹیس کا ایک شائبہ درد کا ایک عنصر محسوس کیا اور میری آنکھوں میں اُس جذبے کی چمک دیکھی۔ جس کو ایک عورت چشم زدن میں پہچان لیتی ہے۔ وہ اس طرح کانپ گئی جس طرح گلاب کا ایک نازک پودا

آغازِ بہار کی سرد ہوا کے جھونکوں سے کانپ جاتا ہے۔ لیکن اُس نے ایسی مری ہوئی آواز میں گویا اُس کے سینے پر لاکھوں من یخ کا بوجھ ہو۔ جواب دیا "جی"

"انجمن آرا کیا واقعی تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں نے نثار کو تمہارے متعلق کچھ نہ کہا ہوگا"

"معلوم نہیں"

یہ معلوم نہیں ایسی سرد مہری سے کہا گیا کہ جس طرح وہ میرا پہلا جھوٹ سُنکر برافروختہ ہو گئی تھی۔ اسی طرح اُس کا ارادی تجاہل دیکھ کر میرے بدن میں آگ لگ گئی۔

"مَیں نے۔ میں نے انجمن آرا میں جو تمہاری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہوں۔ جو تمہاری محبّت کو اپنی محبت خیال کرتا ہوں۔ جو تم سے ایسی وارفتگی ایسی مایوسی سے محبت کرتا ہوں۔ جیسے کوئی شخص آسمان پر دُور پورن ماشی کے چاند سے محبّت کرے جو اظہارِ تعشق کو بھی اپنی محبت کے لئے باعثِ ننگ سمجھتا ہوں"

مجھے اُس وقت محسوس نہ ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت میں مَیں ایک نامعلوم اذیت سے بیقرار ہو کر چلا چلا کر باتیں کر رہا تھا۔

"چپ رہو تم اپنی زبان سے اُن خیالات کو جھٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ جن پر تم یقین رکھتی ہو۔ آج اتفاق سے تم نے میرا راز پا لیا ہے۔ مجھے کہے جانے دو۔ میرے دل کی بھڑاس نکل جانے دو۔ اتنا عرصہ وہ آتش فشاں پہاڑ جو میرے سینے میں مدفون تھا۔ اسے پھٹنے دو۔ اور مجھی کو جلا کر راکھ کرنے دو۔ میری محبّت کا انتہائی کمال یہی ہے کہ مَیں تمہیں دیکھ لوں۔ لیکن آہ مجھے کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا۔ کہ مَیں تمہیں اس طرح اس حالت میں اپنے روبرو دیکھونگا۔ اور آہ بدگمان دیکھوں گا"

مَیں خاموش ہو گیا زیادہ کہنے کا کیا فایدہ تھا۔ مَیں خود اسقدر کہکر اب پچھتا رہا تھا۔ وہ اب تک سر جھکائے حیرانی کے وفور میں گم کھڑی تھی۔ گویا غور کر رہی تھی کہ

میری باتوں کا کیا جواب دے آخر اُس نے میری طرف دیکھا اور ایک افسردہ انداز میں مُسکرائی۔ پھر اُس نے گہری سانس لی۔ گویا مجھ پر اُسے رحم آ رہا تھا۔

"میں آپ پر اعتبار کرتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

(۴)

اس سے دو مہینے بعد کا واقعہ ہے۔ کہ ایک ابر آلود شام کو جب ہر شے پر تاریکی اور اُداسی محیط تھی۔ مَیں اپنے کمرے میں بیٹھا انجمن آرا سے اپنی پہلی ملاقات کے نقوش کو اپنے تصور سے اور زیادہ گہرا کر رہا تھا۔ میرے کمرے کے برآمدے سے نثار کے مکان کا صحن کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ یکایک مَیں نے دیکھا کہ نثار ایک عورت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے صحن میں سے گزرا۔ اس قدر نزدیک سے مجھے اُس عورت کی صورت صاف نظر آ رہی تھی۔ وُہ عنایت تھی۔ مَیں دیوانہ وار اُچھل پڑا۔ اور تمام راستے کو ایک لمحے میں طے کر کے نثار کے قریب جا پہنچا۔ نثار مجھے دیکھ کر ہنسا۔ عنایت نے بھی میری طرف مُسکرا کے دیکھا اور کہا "کہئے انور صاحب مزاج اچھے ہیں"

مَیں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے پاس نام نہاد تہذیب کے اصول برقرار رکھنے کے لئے کوئی وقت نہ تھا۔

مَیں نے نثار سے پوچھا "اسے کہاں لئے جا رہے ہو"

"اندر"

"اندر کہاں"

اُس نے ذرا درشت لہجے میں کہا "گھر"

مَیں نے دردناک تعجب سے پُوچھا "اسے گھر لئے جا رہے ہو"

"ہاں گھر لئے جا رہا ہوں۔ کیوں کیا ہے"

وہ اب بہت ناراض معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بیتاب ہو کر کہا "اسے گھر لئے جا رہے ہو۔ اس عورت کو۔ نثار تمہیں یاد نہیں رہا۔ کہ وہاں تمہاری بیوی موجود ہے۔ جو تم پر بلا شرکت غیرے حق رکھتی ہے۔ جو تمہیں دیکھ کر جیتی ہے اس کے علاوہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم اس بدکار حسن فروش عورت کو جسے مجھے عورت کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ انجمن آرا کے پہلو بہ پہلو بٹھاؤ گے تم کس طرح گوارا کرو گے کہ جس نے تمہارے سوا کسی غیر مرد پر نگاہ نہیں ڈالی۔ اس کے سامنے اس کو لیجا کر بٹھا دو۔ جس کے لب، جس کی آنکھیں، جس کا چہرہ ہوس کے تازہ نشانات سے آلودہ ہے۔"

عنایت خوف کے مارے نثار کے بازو سے چمٹی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ میری طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ نثار بھی چند لمحوں کے لئے مرعوب ہو گیا تھا لیکن بہت جلد میری باتوں کا تمام اثر زائل ہو گیا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میرا انجمن آرا سے کیا واسطہ ہے۔ اُس کے دل میں ایک زہریلا شبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اُسکے دِل میں اس دن کی یاد تازہ تھی۔ جب پہلی دفعہ عنایت کے ہاں جاتے وقت اضطراری طور پر میں نے انجمن آرا کا نام ایک خود فراموش بیتابی سے لیا تھا۔ آخر اُس کے شبہات نے الفاظ کی صورت اختیار کی۔ اُس نے عنایت کی موجودگی کو قطعاً فراموش کر دیا۔ اُس نے میری طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا اور پھر رشک سے بھرائی ہوئی آواز میں پُوچھا "تمہیں اس سے کیا۔"

مجھے چاہیئے تھا کہ اُس وقت سنبھل جاتا۔ لیکن مَیں پاگل ہو گیا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "بیشک مجھے اس بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن تمہیں یہ حق کب سے حاصل ہے کہ تم ایک معصوم عورت کی زندگی کو یوں تباہ کر دو۔ دُنیا کی۔ مذہب کی کونسی طاقت نے تمہیں یہ اختیار دیا ہے کہ تم ایک جاندار ہستی کی زندگی کو یوں برباد کر دو۔"

مَیں نے یہ فقرے ایسے جوش میں کہے تھے کہ اسکے شبہ کو تقویت ہوگئی۔ اُس نے اب رشک سے بیقرار ہو کر کہا۔ "تم ہر وقت انجمن آرا کے طرفدار بننے والے کون ہوتے ہو۔ مَیں تمہاری نگاہیں دیکھ رہا ہوں۔ مُدّت سے مجھے شبہ تھا کہ تم مارِ آستین کی طرح مجھے ڈسو گے۔ لیکن یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم نے اسقدر جلدی اپنی نرم آواز اپنی شاعری اپنی فصاحت سے میرے دل کے آرام کو برباد کر دیا ہے۔"

مَیں نے چلّا کر کہا۔ "غلط بالکل غلط۔ تمہارے دِل میں جو شبہ ہے۔ اُسے نکال دو۔ ایسے دل کو نکال دو۔ جو انجمن آرا پر اس قسم کے ذلیل شبہے کرتا ہے۔"

لیکن اب وہ اپنے قابو میں نہ تھا۔ اُس نے جیب سے شکاری چاقو نکالا۔ اور مجھ پر جھپٹا۔ لیکن ایک لمحے میں انجمن آرا ہمارے درمیان تھی۔ وہ کواڑ کے پیچھے کھڑی سب کچھ سُن رہی تھی۔ نثار نے تعجب سے انجمن آرا کی طرف دیکھا۔ جو میرے آگے کھڑی نہایت سکون سے کہہ رہی تھی:۔

"مجھے مارو۔ مَیں تمہارے شبہات کی ذِلّت برداشت نہیں کر سکتی۔"

نثار انجمن آرا کے اس اطمینان سے مرعوب ہوگیا۔ لیکن اُس نے کہا۔ "جھوٹی" اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر جا پڑا۔ انجمن آرا نے پھر کہا۔ "مَیں حلف اٹھاتی ہوں کہ تمہارا شبہ بالکل غلط ہے۔ مجھے انور سے کوئی واسطہ نہیں۔ مَیں اُسے اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔"

نثار چپ چاپ اندر چلا گیا۔ ابھی تک اُس کے دل میں انجمن آرا کی اتنی وقعت تھی۔ کہ وہ اُس کے حلف کا یقین کر لیتا۔ عنایت اس سے بہت پہلے مجھے برافروختہ دیکھ کر اکیلی نیچے اُتر گئی تھی۔ جاتے وقت انجمن آرا نے مجھ پر صرف ایک نگاہ ڈالی۔ گویا مجھ سے عفو کی طالب ہے۔ لیکن اُس وقت میں اس نگاہ کا مطلب نہ سمجھ سکتا تھا۔"

(۵)

اس واقعہ کے بعد میرا انتشار کے ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ انجمن آرا کے ان فقروں سے جن میں اُس نے مجھ سے یکسر بے تعلقی کی قسم کھائی تھی۔ مجھے سخت رنج پہنچا۔ مَیں جانتا ہوں کہ مجھے انجمن آرا سے کسی قسم کی توقعات رکھنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن پھر بھی میرا دل عقل کے ہر تاویل آفریں خیال کو رد کرتے ہوئے اس رنج سے کُڑھتا رہا جلتا رہا۔ مَیں جانتا تھا کہ اس قسم کی امید جنون ہے حماقت ہے۔ لیکن مجھے آرزو تھی کہ کاوش اس وقت انجمن آرا نسوانیت کی ہر بندش کے خلاف مذہب کی ہر قید کے خلاف اخلاق کے ہر اصول کے خلاف خود اپنی طبیعت کے خلاف کم از کم میری محبت کا اعتراف تو کرتی۔ مَیں اُس شہر کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اور ایسی کشتی کی طرح جو طوفانی سمندر کی باد پا لہروں پر ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔ مُلک بہ مُلک شہر بہ شہر بلا مقصد پھرتا رہا۔ اُس الم فرسا دور کی کیفیات میرے لئے تو شاید ایک دردناک عشرت ہو۔ لیکن ناظرین اس اندوہ فرسا تسلسل کا بیان سُننے کے لئے غالباً وقت نہ نکال سکیں گے۔ اس کے علاوہ میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ اب زہر میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اور شاید اس افسانے کے اتمام سے پیشتر فوری طور پر اثر کر جائے۔ اس لئے مَیں بہت جلد اس سرگذشت کے انجام تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ایک سال کی ہرزہ گردی کے بعد مَیں لاہور واپس آ گیا۔ میرے زخم مندمل تو نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اُن پر انگور آ چکا تھا۔ ہر چند کہ انجمن آرا میری رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ مگر وقت نے اس اضطراب کو جو پہلے پہلے اس کے تصوّر سے قایم رہتا تھا۔ ایک یاس انگیز سکون میں تبدیل کر دیا۔

ایک شام میرا ایک قدیم دوست جو اس تمام واقعہ کا رازدار تھا۔ میرے پاس آیا۔

اُس نے کہا" انور ایک عجیب واقعہ رونما ہوا ہے تم تو ایک شاعر ہو۔ اور اس لئے جذبات کے ارتقا اور اُن کی نشو ونما سے ذاتی طور پر اچھی طرح واقف ہو۔ بھلا دیکھوں تم اس بات کی کیا تحلیل کرتے ہو۔"

مَیں نے ایک مصنوعی سے اشتیاق میں پوچھا "کیا بات ہے۔"

"یہاں کے ارباب نشاط میں ایک نئی حُسن فروش کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے متعلق عجیب عجیب روایات مشہور ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آئی ہے یا کس کی لڑکی ہے۔ حتّے کہ خود اس کے سازندے بھی اس راز سے ناواقف ہیں سب سے حیرت انگیز یہ بات ہے۔ کہ کئی تماشبین گناہ کے بدتریں پہلو کے ارتکاب کے لئے اُس کے ہاں گئے۔ اور ناکام واپس آئے۔ رات کو کوئی شخص اس کے ہاں نہیں آسکتا۔ وہ کم بولتی ہے۔ بہت کم مُسکراتی ہے۔ اور بہت کم باہر جاتی ہے"

مجھے ان باتوں پر یقین نہ آیا۔ لیکن میرے دوست نے مجھے ہر ایک طرح کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ آخر کار مَیں نے اُس سے وعدہ کر لیا۔ کہ مَیں کسی دن وہاں ضرور جاؤنگا۔ اور واپس آکر اپنے تجربات اور اُن تجربات سے جو نتائج اخذ کئے ہونگے اُن کے ماحصل سے اُسے مطلع کرونگا۔ میں نے اُس کا نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جہاں افروز تھا۔ دوسرے دن میں کسی نامعلوم سی کشش سے بیتاب آخر جہاں افروز کے مکان پر جا ہی پہنچا۔ مَیں سیڑھیوں پر تھا کہ مجھے گانے کی آواز سنائی دی۔ ہارمونیم بج رہا تھا اور کوئی عورت نہایت باریک اور شیریں سُروں میں گا رہی تھی میرے کانوں میں ایک مصرع اچھی طرح پڑا۔ ع

کچھ پھول اہل شوق پہ برسا کے رہ گئے

اور مَیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میرے قدم جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ مصرع میں نے کہیں سُنا ہے۔ اور ایسے حالات میں سُنا ہے جو انجیر آرا

کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور پھر یکایک مجھے یاد آگیا۔ یہ میری اپنی غزل تھی، جو مَیں نے ایک دفعہ نثار کو لکھ کر دی تھی۔ میرے ذہن میں ایک عظیم کشمکش ایک پریشان کن جدوجہد ہونے لگی۔ میری غزل یہاں کس طرح پہنچی۔ یہ عورت کون تھی۔ اس کا نثار سے کیا تعلق تھا۔ اور اس قسم کے کئی سوالات میرے دل میں آنے لگے۔ مَیں اس ذہنی اذیت کو برداشت نہ کر سکا۔ باقیماندہ سیڑھیوں کو مَیں دو چھلانگوں میں طے کر کے اُوپر جا پہنچا۔ میرا گمان درست نکلا۔ سامنے ہارمونیم کے قریب کچھ متعجب۔ کچھ مخوف ایک ہاتھ باجے کی سروں پر رکھے۔ ایک اپنے سینے پر رکھے۔ انجمن آرا کھڑی تھی۔

بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا "تم انجمن آرا۔ تم یہاں۔ آہ"

میرا سر بے اختیار چھاتی پر ڈھلک پڑا۔ اور گویا کائنات کی ہر ایک چیز میرے لئے بیجان ہو گئی۔ بےحس ہو گئی۔ تاریک ہو گئی۔ لیکن وہ اُسی بھولپن کے پُرانے انداز سے میرے قریب آگئی۔ اُس نے میرا بازو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور صرف ایک لفظ کہا "انور"

مَیں نے اُس کے دونوں ہاتھ سختی سے جھٹک دئے اور حقارت سے کہا "تمہیں وہ عورت ہو جس سے مَیں محبت کرتا تھا۔ نہیں میں ایک معصومیت کی دیوی بھولپن کی تصویر عصمت کے پیکر سے محبت کرتا تھا۔ اس حسن فروش ہستی سے نہیں۔"

اُس نے نہایت لجاجت سے کہا "مَیں اب بھی وہی انجمن آرا ہوں۔"

"جھوٹی"

اُس نے اپنی گردن کو اس طرح بلند کیا۔ جس طرح ایک شیرنی اپنے بچّوں کو کُچلتے ہوئے دیکھ کر سر بلند کرتی ہے "تمہیں یاد ہے۔ نثار نے بھی مجھے ایک دفعہ جھُوٹی کہا تھا۔ مَیں اُس وقت بھی سچّی تھی۔ اب بھی سچّی ہوں۔"

"اے کاش تم اس وقت جھوٹی ہوتیں۔ اے کاش اُس وقت کچھ تمہیں میرا خیال ہوتا۔"

میری آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

اُس نے نہایت آہستہ سے کہا۔ "مجھے اُس وقت بھی تمہارا خیال تھا۔"

مَیں بیتاب ہو گیا۔ "ایک اور جھوٹ"

وہ اب بالکل میرے قریب آگئی۔ اُس کی سانس مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہونے لگی۔

"مَیں نے بیشک اُس وقت حلف اُٹھایا تھا۔ جھوٹ اُٹھایا تھا۔ خدا مجھے اس گناہ کے لئے معاف کرے۔ مَیں نے محض تمہارے بچانے کے لئے ایسا کیا تھا نثار اُس وقت پاگل ہو گیا تھا۔ خدا جانے کیا کر بیٹھتا۔

مجھے تمہاری جان اپنے ایمان سے زیادہ عزیز تھی۔ میرا خیال تھا۔ کہ مجھے نثار سے محبت ہے۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد مجھے محسوس ہوا۔ کہ یہ محبت نہ تھی۔ تمہیں دیکھ لینے کے بعد تم سے یہ سُن لینے کے بعد کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میرے دِل میں نثار کی کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ آہ مَیں نے دُنیا کی نگاہ میں گناہ کیا۔ مذہب کے لحاظ سے گناہ کیا۔ اور تم۔ تم بھی مجھے جھوٹا بناتے ہو۔"

وہ اب رونے لگی۔ جذبات کے زیر اثر اتنا کچھ کہہ کر جو اس کی نسوانیت کے منافی تھا۔ اُسے اپنی تذلیل کے احساس نے رونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میرے دل میں اُس کے جذبات کی کوئی صدائے بازگشت نہ پیدا ہوئی تھی۔ مَیں نے بے اعتباری کے لہجے میں کہا۔ "پھر تم یہاں اِس جگہ کیسے آئیں۔"

اُس کا رونا یکقلم بند ہو گیا۔ اُس نے جوش سے لبریز آواز میں کہا۔ "تم اپنے آپ کو شاعر کہتے ہو۔ اور محبت جو شاعری کی جان ہے۔ اُس سے ناواقف ہو۔ مَیں نے

تمہارے لئے قربانی کی۔ اپنی زندگی۔ اپنی عزّت کی، اپنی نسوانی وقار کی قربانی کی۔ مَیں سمجھتی تھی۔ کہ تم اپنی محبت سے مجبور ہو کہ آخر کار تم پھر لاہور آؤ گے۔ مجھے دیکھنا چاہو گے اور اس کا نتیجہ رسوائی ہوگا۔ بدنامی ہوگا۔ اور اس رسوائی سے اس بدنامی سے تمہاری عزّت کو۔ ہاں اُس عزت کو جسے تم دُنیا کی ہر شے پر مقدم سمجھتے تھے صدمہ پہنچیگا۔ تم لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ مَیں نے مجبور ہو کر یہ طریقہ اختیار کیا۔ تاکہ تم بار غیرت کی وجہ سے مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ اور تم مجھ سے مِل سکو۔"

اتنا کہہ کر وہ ایک کُرسی پر بیٹھ گئی۔ گویا انتہائی تھک گئی ہو۔ مَیں کچھ کہے سُنے بغیر واپس آگیا۔ دوسرے دِن مجھے اس کا خط موصول ہُوا۔

مَیں یہ بے اعتباری کی زندگی نہیں جینا چاہتی۔ مَیں نے جو کچھ کیا، تمہارے لئے کیا۔ اور تمہیں مجھ پر یقین نہیں رکھتے۔ مَیں اپنی انگشتری کا ہیرا چاٹ رہی ہوں۔ خُدا مجھے معاف کرے۔ یہ خط تمہیں اُس وقت ملیگا۔ جب مَیں اس دُنیا میں نہ رہونگی۔"

یہ خط پڑھ کر میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ آہ مظلوم انجمن آرا۔ اُس دن مجھے اُسکے عظیم الشان ایثار پر یقین نہ آتا تھا۔ اب مجبوراً یقین کرنا پڑا۔ ہم دونوں ساری عمر میں صرف دو دفعہ ملے۔ اور مِل کر باتیں کیں۔ اس کے علاوہ ہماری شاہ راہ حیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہی۔ اس کے بعد ایسی عمر بسر کرنا جس کا انجام و آغاز سراسر کلفت ہو۔ میرے لئے ہر طرح ناممکن تھا۔ مَیں نے بھی زہر پھانک لیا۔ دُنیا کچھ کہے لیکن انجمن آرا کے متعلق . . . ."

(ہزار داستان)

شاہکار

امریکہ کے مشہور افسانہ نویس او ہنری کے ایک مختصر افسانہ کا ترجمہ

(از جناب محمد دین صاحب تاثیر۔ ایم اے)

لارنس ہال کے جنوب کی طرف درختوں سے گھری ہوئیں سڑکیں دیوانہ وار باہم دست و گریباں ہوتی ہیں۔ اور عجیب طرح کے زاویے بناتی ہوئی ایک دوسرے سے آملتی ہیں۔ ایک ہی سڑک اپنے آپکو دو دو تین تین بار کاٹتی ہے۔ یہاں کے دو منزلے مکانات ایک ہی طرز کے بنے ہوئے ہیں۔ بھورا رنگ چاروں طرف برآمدے اور دروازے کے آگے بڑھا ہوا چھجا جس کے نیچے سیمنٹ کے ستون ایستادہ ہوتے ہیں۔ یہاں عام طور پر بے فکرے لوگ۔ آرٹسٹ۔ پروفیسر وغیرہ رہتے ہیں۔

یہیں کہیں دوسری منزل میں دو پارسی خاتونیں مقیم تھیں۔ انکے پاس فقط تین کمرے تھے۔ ایک ملاقات کا کمرہ جو سٹیڈیو بھی تھا۔ ایک سونے کا کمرہ اور ایک کھانے پکانے کا کمرہ تھا۔ اس مختصر سے سامان کے ساتھ انہوں نے اپنی زندگی مصوری کے لئے وقف کر دی تھی۔

وہ یہاں فروری کی کھلی بہار میں فروکش ہوئی تھیں۔ اور تب سے انہیں فرحت افزا جگہ سے الفت ہو گئی تھی۔ خوشبوؤں سے لدی ہوئی سرد سرد ہوا بدن میں خون کے ساتھ شعلۂ جوالہ کی طرح دوڑ جاتی ہے۔

نومبر نمونیا کو ساتھ ہی لیتا آیا۔ بدلے ہوئے موسم میں کپڑے پہننے میں فناسی

بے احتیاطی موت کے لئے بہانہ ہوجاتی ہے۔ اور فیروزہ جو پہلے ہی اکہرے بدن کی تھی بہت ہی آسان شکار تھی۔ ناچار۔ بیچاری بستر پہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی ایک قد آدم کھڑکی سے سامنے مکان کی بھوری دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دن ڈاکٹر نے کاؤسہ کو علیحدہ بلا کر مریضہ کی حالت صاف صاف بیان کردی۔ دونوں "لنگز" Lungs تک اثر پہنچ چکا تھا۔ دس میں ایک "چانس" Chance ہے۔ پھر اس نے پارہ اتارنے کے لئے تھرمامیٹر کو جھٹک کر کہا۔ اور وہ ایک چانس یہ ہے۔ کہ اس میں زندہ رہنے کی خواہش ہو۔ مگر تمہاری سہیلی نے تو یہ فیصلہ کردیا ہے کہ وہ اب تندرست نہ ہوگی۔ کیا اسے کوئی مایوسی ہوتی ہے؟ اس کے دل میں کوئی ایسی آرزو ہے؟

"آرزو؟ اس کی یہ خواہش تھی۔ کہ وہ کشمیر جا کر "ڈل" کی تصویر کھینچے اور تو ......"

"تصویر! واہ! کیا اس کے دل میں کوئی ایسی آرزو ہے جو قابلِ غور ہو مثلاً کوئی آدمی؟"

"آدمی؟" کاؤسہ کی آواز .... رک رک کر نکل رہی تھی۔

"آدمی؟ تو کیا آدمی اس قابل ہے کہ ...... نہیں ڈاکٹر صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر یہ محض کمزوری ہے۔ میں وہ سب کچھ کر گذروں گا۔ جو سائنس کر سکتی ہے۔ مگر جب مریض اپنے دم گننے شروع کردے اور صحت سے مایوس ہوجائے۔ تو میں دوائی کے فائدوں میں سے پچاس فی صد Percent "پرسینٹ" پہلے ہی نکال لیا کرتا ہوں۔

ل۱ پھیپھڑے ل۲ موقعہ ل۳ ۵۰ فی صدی

ڈاکٹر کے جاتے ہی کاؤسہ ایک ہاتھ میں پانی سے لبالب بھری ہوئی طشتری اور دوسرے ہاتھ میں ایک ڈرائینگ بورڈ اٹھا کر سیٹی بجاتی ہوئی فیروزہ کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ فیروزہ کھڑکی کی طرف منہ کئے اس طرح لیٹی ہوئی تھی۔ کہ بستر پر شاید ہی کوئی سلوٹ پڑی ہو۔ کاؤسہ نے یہ سمجھ کر کہ شاید وہ سو رہی ہو۔ سیٹی بجانی بند کر دی۔ اور ڈرائینگ بورڈ کو پیوست کر کے طشتری میں ایک فوٹو نیگیٹو ڈال دیا۔ ہندوستان میں فنون لطیفہ سے بیمانہ بے پروائی برتی جاتی ہے غریب مصوروں کو سامان خورد و نوش کے لئے ابتدا میں فوٹو وغیرہ کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اسی سونے کے کمرے میں جہاں فیروزہ لیٹی ہوئی تھی ایک کونے میں ایک لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ڈارک روم DarkRoom بھی تھا۔ کاؤسہ نے ابھی خاکہ کے طور پر کچھ لکیریں ڈالی تھیں کہ اسے بار بار ایک دبی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے بستر کی طرف لپکی۔ فیروزہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اور وہ کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ گن رہی تھی۔

"بارہ" اور کچھ دیر کے بعد "گیارہ" پھر "دس" اور پھر "نو" اس کے بعد "آٹھ" اور "سات" قریباً اکٹھے ہی۔

کاؤسہ نے غور سے کھڑکی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ باہر ایک میدان تھا اور سامنے دیوار پر ایک عشق پیچان کی پژمردہ بیل تھی۔ جس کی جڑیں تک سوکھی ہوئی تھیں خزاں کے نفس سرد نے اس کے پتے خشک کر دیئے تھے۔ اور اب اس کی ٹنڈ منڈ ٹہنیاں یونہی لٹک رہی تھیں۔

"کیوں فیروزہ کیا ہے؟" فیروزہ کہہ رہی تھی "چھ" اور ساتھ ہی دبی آواز میں کہا "اب وہ جلد جلد گر رہے ہیں۔ تین دن ہوئے تب سو کے قریب تھے اور گنتے گنتے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ مگر اب آسان ہے۔ لو وہ ایک اور گرا۔ اب فقط

پانچ رہ گئے ہیں۔"

"پانچ کیا! تم اپنی کاؤسہ کو بھی بتاؤ نا۔" "پتے عشق پیچاں کے پتے۔ جب آخری پتہ گریگا۔ تو میں بھی چل بسوں گی۔ مجھے تین دن سے پتہ ہے۔ ڈاکٹر نے تمہیں نہیں بتایا؟"

"واہ! بات ہی کی ہوگی۔ بھلا اس بے برگ بیل کا تمہاری صحت سے کیا تعلق ہے۔ ڈاکٹر تو کہتا ہے کہ تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ جانے دو اس وہم کو۔ واہ۔ لو یہ شوربہ پی لو۔ اور مجھے تصویر بنانے دو۔ تاکہ تمہاری کاؤسہ سامان خورد و نوش مہیا کر سکے۔ تم تو بچوں سے بھی بڑھ گئی ہو۔"

فیروزہ کی آنکھیں کھڑکی میں گڑی ہوئی تھیں "پیاری کاؤسہ اب تمہیں شوربہ بنانے کی ضرورت نہ رہے گی لو وہ ایک اور گرا۔ نہیں۔ نہیں۔ مجھے شوربہ نہیں چاہئے۔ اب فقط چار رہ گئے ہیں۔ میں اندھیرا ہو جانے سے پہلے آخری پتہ کو گرتا دیکھنا چاہتی ہوں اور پھر میں بھی ......"

"پیاری فیروزہ:" کاؤسہ بستر پر جھکی ہوئی تھی۔ پیاری فیروزہ کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ جب تک میں کام ختم نہ کروں۔ تم کھڑکی کی طرف نہ دیکھو گی۔ مجھے یہ تصویر کل دینی ہے اور مجھے روشنی درکار ہے۔ ورنہ میں پردہ ڈال دیتی۔ فیروزہ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "کیا تم سٹڈیو میں جاکر تصویر نہیں اتار سکتیں؟"

"نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہاں تمہارے پاس بیٹھوں۔ اور پھر میں نہیں چاہتی کہ تم ان پتوں کو دیکھتی رہو۔"

"اچھا تو پھر جب ختم کر لو تو مجھے بتا دینا۔ یہ کہہ کر فیروزہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سنگ مرمر کے مجسمہ کی طرح پڑی ہوئی تھی "ضرور بتا دینا کیونکہ مجھے آخری پتہ کو گرتے ہوئے دیکھنا ہے۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ سوچتے

سوچتے رہ گئی ہوں۔ میں دنیا کی ہر ایک چیز سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنا چاہتی ہوں۔ اب میں ان بیچارے تھکے ہوئے پتوں کی طرح تیرتی ہوئی نیچے نیچے چلی جاؤنگی۔"

"تم سونے کی کوشش کرو۔ میں جا کر بابا فرزوق کو بلاتی ہوں۔ وہ بوڑھے راہب کے لئے اچھا موڈل Model ہوگا۔ میرے آنے تک ہلنا نہیں۔ میں ابھی ایک منٹ میں آئی۔" بابا "فرزوق بھی مصور تھا اور وہ نچلی منزل میں رہتا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ برس سے کچھ زیادہ تھی۔ اس کی شکل ایسی تھی کہ ایک بار دیکھنے سے پھر بھولتی نہ تھی۔ اس کے سر کے تمام بال سفید تھے۔ مُردنی چھائے ہوئے سفید نہیں بلکہ موتی کی طرح صاف اور چمکتے ہوئے پرانے موتی کی طرح بالائی کے رنگ کے سفید سفید گھنے گھنے ابرو نصف دائرہ بناتے ہوئے پلکوں سے ملے ہوئے تھے۔ سُرخ آنکھوں میں ابھی تک چمک باقی تھی۔ اس کے چہرہ پر کوئی گہری جھریاں نہ تھیں۔ مگر اس کی جلد پر اس طرح لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ جیسے ایک کاغذ کے پرزے کو مروڑ کر ایک ٹھوس گیند سی بنائی جائے۔ اور پھر اس کو کھول کر کچھ کچھ صاف کیا جائے۔

بابا فرزوق ایک ناکام مصور تھا۔ چالیس برس سے وہ بُرش چلا رہا تھا۔ اور ابھی تک اسے یہ بھی نصیب نہ ہوا تھا کہ وہ اس سراب صفت معشوقہ کے دامن تک کو چھو سکے۔ اسے ہمیشہ ایک شاہکار بنانے کا خیال رہتا تھا۔ مگر یہ محض خیال ہی تھا۔ اب اس کا ذریعہ معاش اشتہارات کے لئے Design ڈیزائن وغیرہ بنانا۔ یا موڈل بننا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ دیسی شراب پیئے رہتا تھا (جسکا جسمانی مظہر ایک سُرخ اور بھدی سی ناک تھی) اور ہر وقت اپنے خیالی شاہکار کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اور یوں وہ ایک تند طبیعت بوڑھا تھا۔ جو رفیق القلبی کو نہایت حقارت سے دیکھتا تھا۔ اور اپنے آپ کو ان پارسی لیڈیوں کا "باڈی گارڈ" تصور کرتا تھا۔

جب کاؤسہ پہنچی تو فرزوق اپنے کمرے کے ایک دھندلے سے کونے میں لیٹا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک سادہ کینوس (کپڑا جس پر تصویر بناتے ہیں) تنا ہوا تھا۔ جو پچیس برس سے فرزوق کے شاہکار کا منتظر تھا۔ "فرزوق کا شاہکار" مصوروں کے حلقہ میں ضرب المثل بن گیا تھا۔

کاؤسہ نے اُس سے فیروزہ کے وہم کا ذکر کیا۔ اور ڈاکٹر کی رائے بھی بتائی۔ بوڑھا فوراً حقارت سے بھری ہوئی آواز میں مریض کے احمقانہ تصورات کے خلاف چلانے لگا: "کیا اس صدی میں بھی ایسے احمق لوگ ابھی تک باقی ہیں۔ حماقت کی بھی کوئی حد چاہیئے۔ ایک مرجھائے ہوئے پتہ کا انسان کی زندگی کیساتھ کیا تعلق ہے۔ واہ! نہیں میں ایسی کم عقل عورتوں کا موڈل بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ تم نے ایسے توہمات اس کے ذہن میں آنے کیوں دیئے؟ آہ بیچاری فیروزہ بائی!"

"وہ بہت کمزور ہو رہی ہے اور بخار نے اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیال پیدا کر دیئے ہیں۔ خیر۔ اچھا فرزوق صاحب اگر آپ موڈل بننا نہیں چاہتے تو نہ سہی اور میری رائے میں تم ایک۔ تم ایک سٹھیائے ہوئے سٹھیائے ہوئے بوڑھے......"

فرزوق جھٹ اسے ٹوک کر چلانے لگا: "دیکھو۔ نا! وہی عورتوں کی سی بات۔ بھلا تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں ماڈل نہیں بنتا۔ لو تم چلو میں ابھی آیا۔ آدھ گھنٹہ سے میں یہی کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہاں تو۔ مگر عورتیں! یہ کسی کی سنتی ہیں...."

کاؤسہ کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر بوڑھا پھر تیز ہو گیا۔ "مگر تمہیں چاہیئے کہ فیروزہ کے دل میں ایسے خیال نہ آنے دو۔ یہ جگہ بھی بیماروں کے لئے اچھی نہیں۔ جب میں اپنا شاہکار بناؤں گا تو پھر ہم سب یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہاں تو؟"

جب یہ دونوں کمرہ میں داخل ہوئے۔ تو فیروزہ سو رہی تھی۔ کاؤسہ نے اشارہ سے فرزوق کو کھڑکی کی طرف بلایا اور دونوں سہمے ہوئے عشق پیچاں کی بیل دیکھنے لگے اور پھر چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ باہر بوندیں پڑ رہی تھیں اور سیاہ بادل اُڑا اُڑ کر آرہے تھے۔ فرزوق اپنی نیلی کمری پہنے ہوئے ایک بیپے پر "پہاڑ کا راہب" بنکر بیٹھ گیا اور کاؤسہ نے پنسل چلانی شروع کردی۔

جب فیروزہ صبح کو اٹھی تو کاؤسہ کھڑکی کے سبز پردہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

فیروزہ نے نہایت ہی کمزور آواز میں کہا "اس کو اٹھا دو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں"

کاؤسہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف گئی اور پردہ ایک طرف کردیا۔

مگر لو دیکھنا رات بھر کی موسلا دھار بارش کے باوجود ابھی تک بھوری دیوار سے لپٹی ہوئی بیل پر ایک پتہ باقی ہے۔ یہ آخری پتہ تھا۔ اس کے ڈنٹھل کا رنگ سیاہی مائل سبز تھا۔ مگر اس کے دندانہ دار کنارے زرد ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ ایک ٹہنی پر زمین سے کوئی پانچ گز کی بلندی پر لٹک رہا تھا۔

"یہ آخری پتہ ہے"۔ ساتھ ہی فیروزہ نے ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہا "میرا تو خیال تھا کہ یہ رات کو گر گیا ہوگا۔ مجھے بارش کی آواز آرہی تھی۔ اچھا۔ آج سہی اور اور پھر میں بھی ہمیشہ کے لئے چین سے سو جاؤں گی"

"فیروزہ۔ فیروزہ" کاؤسہ کا اترا ہوا چہرہ تکیہ کو چھو رہا تھا۔ "اگر تمہیں اپنی پرواہ نہیں۔ تو میرا ہی خیال کرو۔ میں تمہارے بعد کیا کروں گی!" لیکن فیروزہ چپ تھی دنیا میں سب سے تنہا روح وہ ہے جو آنے والے پُراسرار سفر کے لئے تیار ہو رہی ہو۔ دن گذرتا گیا۔ بھوری دیوار سُرخ ہو رہی تھی اور ابھی وہ آخر

سے لٹکا ہُوا تھا۔ رات آگئی اور مغرب کی تند ہوا بارش کو ساتھ لائی۔ تمام رات مینہ کھڑکیوں کے شیشوں پر شور مچاتا رہا۔ اور جب صبح ہوئی تو دھن کی پکی فیروزہ نے کھڑکی کا پردہ ہٹائے جانے کا حکم دیا۔ مگر وہ پتہ بدستور وہیں تھا۔

فیروزہ دیر تک اِسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے کاؤسہ کو جو چوزہ کا شوربہ تیار کر رہی تھی۔ بلا کر کہا: "کاؤسہ میں ایک گناہ عظیم کی مرتکب ہو رہی تھی۔ اور کسی طاقت نے یہ پتہ اِس لئے رہنے دیا ہے کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو۔ واقعی موت کی تمنّا کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ لاؤ میرے لئے شوربہ لاؤ اور دودھ اور نہیں۔ اچھا پہلے ایک دستی آئینہ لاؤ۔ اور میرے اردگرد تکیے رکھ دو۔ میں تمہیں کھانا تیار کرتے ہوئے دیکھوں گی" اور ایک گھنٹہ کے بعد اس نے کہا "کاؤسہ مجھے امید ہے کہ کسی نہ کسی دن میں سرینگر جا کر ڈل کی تصویر اتاروں گی۔"

دوپہر کے بعد ڈاکٹر پھر آیا۔ اور کاؤسہ کسی بہانے سے اسے ڈرائینگ روم میں اکیلی جا ملی۔

"اب تو برابر کا چانس ہے۔ اچھی نرسنگ سے تم جیت جاؤ گی۔ اور اب مجھے نچلی منزل میں ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔ فرزوق نام ہے سب اسے "بابا۔ بابا" کہتے ہیں۔ شاید مصوّر ہے۔ اسے بھی نمونیا ہے آدمی بوڑھا ہے اور اٹیک attack بہت ایکیوٹ acute ہے کوئی امید نہیں۔ مگر آج اسے ہسپتال بھجوا دوں گا۔ بیچارے کے یہ آخری دن تو آرام سے گذر جائیں گے۔"

دوسرے دن ڈاکٹر نے کاؤسہ کو کہا: "اب کوئی خدشہ نہیں۔ تم نے موت پر فتح پالی ہے۔ اب غذا اور احتیاط بس اور کچھ نہیں۔"

سہ پہر کے وقت جب فیروزہ بستر پر تکیوں کے سہارے سے بیٹھی ہوئی اُونی

جھرایں بن رہی تھی۔ کاڈسہ آکے اس سے لپٹ گئی۔ اور کہنے لگی" فیروزہ مجھے کچھ تم سے کہنا ہے...... آج بابا فرزدق ہسپتال میں نمونیا سے مرگیا ہے۔ دو دن ہی بیمار رہا ہے۔ پرسوں خادم نے اسے اپنے کمرہ میں کراہتے ہوئے سُنا۔ اس کی جوتی اور کپڑے ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ ایسی خوفناک رات میں کدھر کو نکلا تھا۔ پھر ایک کونے میں لالٹین اور ایک سیڑھی پائی گئی۔ اور کچھ ٹوٹے ہوئے برش تھے۔ اور ایک ڈبہ جس میں زرد اور سبز رنگ ملے ہوئے تھے۔ اور وہ دیکھو باہر جو عشق پیچاں کا آخری پتہ نظر آرہا ہے۔ یہ جس نے تمہاری جان بچائی ہے۔ پیاری وہ فرزدق کا شاہکار ہے"

(نیرنگ خیال)

صحبتِ ناجنس

(از سید سجاد حیدر صاحب یلدرم- بی- اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

(دو لڑکیوں میں خط وکتابت)

حیدر آباد دکن، ۲۴ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء

میری پیاری سلما جانی! جو باتیں میں کسی سے کہہ نہیں سکتی وہ تمہیں لکھنا چاہتی ہوں، ہائے وہ مدرسے کے دن کہ جب مجھے کوئی تکلیف ہوئی یا مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی اور میں تمہارے کمرے میں پہنچی، اگر تم کسی بات کسی کام میں مشغول بھی ہوئیں تو بے تحاشا تم سے لپٹ کے، گلے میں باہیں ڈال کر، تمہارا مُنہ چوم کے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اپنا دردِ دل تمہیں کہہ سُنایا اور دل کی بھڑاس نکال لی۔ حیدرآباد آہ کتنی دُور ہوں، پھر اللہ رکھے۔ تم میاں رکھتی ہو، بال بچے رکھتی ہو، گھر کے کام دھندے میں مشغول ہو، دیکھوں تمہیں اس خط کے پڑھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں۔

مجھے یہ خط "میں خیریت سے ہوں اور تمہاری خیر و عافیت کی خواہاں" سے شروع کرنا چاہیئے تھا۔ مگر طبیعت یکسو ہوتی تو کرتی، تمہاری طرح تھوڑا ہی ہوں، تمہاری زندگی میں نہ کوئی شے زیادہ نہ کوئی شے کم، جو تم چاہتی تھیں وہ سب موجود ہے۔ مجھے دیکھو، مجھ پہ کیا بپتا پڑی! پوچھو تو سُناؤں اور دل نہ بھرے، نہ پوچھو پھر بھی سُناؤں گی۔

میں نے تمہیں نہیں لکھا، تین مہینے ہوئے میں دُلہن ہو گئی! وہ عذرا جسے تم

ہمیشہ "دیوانی لڑکی" کہا کرتی تھیں اب "عقل والی عورت" ہے، مصیبتوں نے سنجیدگی سکھا دی۔

ابھی آدھ گھنٹہ ہوا، ایک دیو گھر سے باہر گیا ہے اور میں نے ایسی سانس لی ہے گویا بڑے ضیق سے نجات پائی، میرے ہول دل کو تھوڑا سا آرام ہوا تو میں نے یہ خط لکھنا شروع کیا، ان تین مہینوں میں ہر روز تمہیں خط لکھنے کا ارادہ کرتی تھی، مگر پریشانیوں سے سستی، اور خوف سے جو عطالت بدن میں پیدا ہو جاتی ہے اُس نے اس ارادے کو پورا نہ ہونے دیا صبح نہیں ہوتی کہ شام ہو جاتی ہے! صبح کھانے کے وقت ہم اپنے کمرے سے نکلتے ہیں۔ اور اُس وقت میرا پیارا دیوبچہ، دیوجثہ، اپنی ٹوپی عجب لااُبالی ڈھنگ سے آدھے سر پر رکھ کر کوٹ عجب بے پروائی سے پہن کر باہر جاتا ہے، میری جان میں جان آتی ہے کہ اتنے میں عورتیں ملاقات کیلئے آجاتی ہیں، اُن سے سر کھپاتی ہوں، تیسرے پہر کو میں کپڑے بدل کے تازی ہوا کھانے کے لئے اپنے ایک قفس سے نکل کر، دوسرے قفس میں بیٹھ کر (جس کی جھلملیاں بند ہوتی ہیں) باغ عامہ کا نظارہ کرتی ہوں، شام ہوتے ہی گھر پہنچتی ہوں، لیکن وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے، رات کو گھر میں سناٹا ہو جاتا ہے، اور اُس خوفناک قوی ہیکل بُت سے میری نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔

یہ شادی کس طرح ہوئی، اس کی تاریخ میں تمہیں نہ لکھوں گی کیا فائدہ۔ صرف ان تین مہینوں کی زندگی کی تصویریں ایک ایک کر کے پیش کرتی ہوں! انہیں دیکھو اور میری سلما! مجھ پر دل دُکھاؤ۔

وہ لڑکپن کی اُمیدیں ایک لال کی ہلکی پرواز کی طرح غائب ہو گئیں، اُڑ گئیں! ایک چھوٹی چڑیا کی طرح اُن کا خون ہو گیا۔ بیاہ کے بعد تیسرا یا چوتھا دن تھا، میں پیانو کے پاس بیٹھی تھی، وہ مجھ سے ذرا دور آرام کرسی پر ڈھیر ہو رہے تھے! میں یونہی بیٹھی بیٹھی

پیانو کو بجا نہیں رہی تھی، بلکہ کھیل رہی تھی کہ میرے کانوں میں وہ بھاری اور کرخت آواز آئی۔

"ہم سُنتے ہیں آپ بہت اچھے گا ئن گاتی ہیں، اگر دو ایک ہم کو سنائیں گا، تو بڑی مہربانی ہوں گی۔"

مَیں رُکی، اور استعجاب آمیز سوال کی نظر سے اُن کی طرف دیکھنے لگی، معلوم نہیں کہ اس نظر کے اُنھوں نے کیا معنی لیئے کہ کہنے لگے :۔

"کوئی راگنی، کوئی ٹپہ، کوئی غزل ہمارے واسطے ہونا، ہم یہ نہیں کہتا کہ کیا سناؤ، آپ کو جو پسند ہو وہ سُناؤ......"

میں مبہوت نظر سے دیکھ رہی تھی اور اس تقریر کو سُن رہی تھی، وہ پھر فرمانے لگے :۔

"اچھا اور کچھ نہیں تو یہ غزل تو سُناؤ :۔

"دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے پری
لگالے پری ہاں لگالے پری"

میں کیا جواب دیتی، حیران تھی، وہ مسلسل گانے کے لئے چیزیں پیش کرتے جاتے تھے۔

"اچھا صاحب! غزل نہیں تو کوئی ناٹک کی چیز : ؎
دیتا ہوں تجھ کو تخت سلیمان کی قسم
(اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر پورے جوش اور نہایت محبت اور حرص بھری نظر سے مجھے دیکھ کر)
مل مجھ سے اے پری تجھے انسان کی قسم"

مجھے چُپ لگی ہوئی تھی، آخر کار وہ اُٹھ کر اور پیانو کے قریب آکر فرمانے لگے :۔

"صاحب! کیا غضب ہے میں اس قدر التماس کیا ہوں آپ قبول نہیں

کرتے ہو، مہربانی کرکے مداری لال یا امانت کی کوئی چیز آپ سنادیں گے تو کیا ہوگا؟"
میں نے بہت چاہا کہ ان کا خیال کسی اور طرف ہٹ جائے، لیکن میں دیکھتی تھی کہ ان کا اصرار بڑھتا ہی جاتا ہے، آخر میں نے مجبور ہو کر کہا:۔
"مداری لال اور امانت کون ہیں؟ میں نے تو کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا"
یہ میں نے صفائی سے جواب دے دیا تھا، تم ہی بتاؤ تم نے بھی کبھی ان کا نام سنا ہے؟ ہم نے تو نہ مدرسے میں، نہ گھر میں، نہ کسی کتاب میں یہ نام دیکھے، مگر انہوں نے اُسے بناوٹ سمجھا اور فرمانے لگے:۔
"ایں! آپ نہیں جانتے، پر میں تو جانتا ہوں، ہندوستان کیا، دکن کیا ہر جگہ ان کا نام مشہور ہے۔" اور تھوڑے سے سکوت کے بعد، ایک پُر نزاکت مگر معنی دار تبسم کے ساتھ فرمایا:۔
"خفا نہ ہو صاحب! جو گانے آپ کو پسند ہوں وہی ہم کو سناؤ۔ البتہ وہ اچھے ہوں گے۔" پیاری سلما! پیاری بہن! تم ہی خیال کر سکتی ہو کہ میں کس مصیبت میں تھی، میرا چہرہ کچھ شرم، کچھ غصہ سے تمتما اُٹھا، اور قریب تھا کہ میں بیہوش ہو جاؤں، مگر ضبط کیا اور طبیعت کو تھاما۔
آہ! مس میری! آیئے اور اپنی چہیتی شاگرد کو دیکھئے کہ پیانو کے سامنے عاجز صمٌ بکمٌ بیٹھی ہے۔ وہ انگلیاں جنہیں آپ پیانو بجاتے ہوئے دیکھ کر تعجب کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ خدا نے انہیں محض موسیقی کے لئے پیدا کیا ہے، آیئے اور اُن انگلیوں کی ذلت کو دیکھئے! سات برس متواتر اسی دن کا خیال کرکے، اسی دن کے لئے تیاری کی تاہم اُن تمام کوششوں کا نتیجہ دیکھئے۔ مداری لال اور امانت آتے ہیں اور آپ کی تعلیمات سب بیکار رہ جاتی ہیں! کیا یہ ہونا تھا! کیا اس لئے میں نے اتنی محنت اُٹھائی تھی، اگر یہ تمام تعلیم بے سُود تھی یعنی اگر

مینڈلسون[۵۱] اور دیگنر[۵۲] مداری لال کے حضور میں سر جھکا کر بھاگ جانے والے تھے، تو یہ تعلیم ہی کیوں دی گئی تھی۔ میری سلما! بتاؤ؟ آخر کیا فائدہ، بتاؤ؟ میں اپنے امانت کے شیدا خاوند سے کیا کہوں، کیا عذر کروں؟

ہاں، میرا خاوند مجھ سے "دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے پری" "یا" مل مجھ سے اے پری تجھے انسان کی قسم" کا طالب ہے۔ میں کیا جواب دوں؟ میں اُن چیزوں سے واقف نہیں، مجھے ہندی گانے نہیں سکھائے گئے"

میں نے سات آٹھ برس انگریزی گانے سیکھے ہیں یہی جواب تھے جو میں دے سکتی تھی اور یہی دیئے۔

اس پر انہوں نے نہایت اخلاق اور نرمی سے کہا:۔

"بہتر! انگریزی گانے ہی سنائیے، میرے کو وہ بھی پسند ہوتے ہیں"

میں اتنی دیر تک انکار کرنے سے شرما رہی تھی، میں نے سوچا کہ جو کچھ میں جانتی ہوں انہیں سنانا چاہئے اس لئے میں نے پوچھا، "کونسا گانا گاؤں"

"صاحب! جو آپ کی خوشی ہو گاؤ، میں کیا کہوں"

اس جواب سے میرا دل بیٹھ گیا، مگر میں نے پھر ہمت کر کے کہا:۔ میں Bulbul & the Rose[۵۳] سناتی ہوں۔

یہ کہہ کے میں نے پیانو کے نوٹ پر نظر گاڑ کر، بجانا شروع کیا پیانو سے ایک درد انگیز فریاد (یاد ہے، یہ مس میری کے الفاظ ہیں، وہ اس راگ کے بجانے کے وقت کہا کرتی تھیں کہ پیانو سے (Plaintive cry نکلتی ہے) نکلنا شروع ہوئی اور میں اس میں محو ہو گئی، غیاث الدین (میرے خاوند غیاث الدولہ، غیاث الملک کا یہ نام ہے، معاف کرنا بھول گئی) میں اب

سلہ ۵۲ یورپ کے مشہور موسیقی داں ہیں۔ ۵۳ ایک انگریزی گانا۔

انٹروڈیوس کرتی ہوں) کچھ دیر تک پیانو کے قریب آ کر کھڑے رہے، پھر آنکھیں اس طرح کھول دیں، گویا پیانو کے شور سے گھبرا رہے ہیں، لیکن سننے کی وضع قایم رکھی، دو ایک منٹ سنا بھی، آخر اس حالت میں نہ رہا گیا؛ بیٹھے، اُٹھے، پھر بیٹھے پھر اُٹھے؛ ایک سگریٹ جلایا، پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ میں نے جب دیکھا تو راگ کے پہلے ٹکڑے کو تو خواہ نخواہ پورا کیا، اور آخری الفاظ کے لئے پردوں پر نہایت زور سے اُنگلی مار کر ختم کیا، ختم ہوتے ہی فرمایا:—

"ماشاءاللہ بہت خوب، لیکن اب سونا چاہئے"، کیا دلشکن داد ہے، اے بیداد! وہ یہ داد دے کر کپڑے بدلنے کے لئے چلے گئے اور وہاں سے بلّی کی خرخر کی طرح یہ آواز آنے لگی:— ؎

میں قربان زلفوں کے لٹکانے والے

مرے دِل کو گلیوں میں بھٹکانے والے

اور میری نظروں میں یہ تصویر پھر گئی کہ مِس میری اور ویگز کو مداری لال نے کیچڑ میں پھینک دیا ہے، اور خود خشکی پر کھڑا ہوا زور زور سے قہقہہ لگا رہا ہے

سلما جانی! ذرا خیال کرنے کا مقام ہے۔ میں کہ دیوانہ وار ہوس کے ساتھ موسیقی کی عاشق ہوں، اور سات آٹھ برس سے اُسے سیکھ رہی ہوں، ہندستانی راگ کتنے جانتی ہوں؟ مولانا حالی کا:—

"اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے"

اور غلام احمد خاں احمدی کا:—

"آ ہمتِ مردانہ جگر میں تری جا ہے — مت آنکھ چرا مجھ سے اگر شرطِ وفا ہے"

"تو ہو مرے ہمراہ تو پروا مجھے کیا ہے — سایہ ترے شہپر کا بہ از بالِ ہما ہے"

؎ معروف انگریزی لفظ بہ معنی تقریب ملاقات

یا شاد یا مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اور ایک آدھ نظم، جسے مس میری نے بدقت تمام اجازت دی تھی کہ ہم لوگ یاد کرلیں اور پیانو یا ہارمونیم پر بجائیں، کیونکہ وہ کہا کرتی تھیں کہ ہندوستانی راگ یاد کرنے سے تمہارا انگریزی مذاق بگڑ جائے گا۔

وہ ہیں کہ رات دن ہندی راگوں میں محو ہیں اب بنے تو کیسے بنے لطف تو جب آتا ہے، جب میں خیال میں مستغرق ہوکر اولڈ لینگ سائین (Old Laug Syne) گانے لگتی ہوں، تو وہ فوراً کوئی گیت شروع کردیتے ہیں جس میں ہجر، وفا، وصل، زخم، تیر، یا ساتو نیا، رسیا، جوبن، سیاں، پیا وغیرہ لفظوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ نہ وہ میری کہی کو سنتے ہیں، نہ میں ان کی کہی کو سمجھتی ہوں؛ کمرہ منارۂ بابل ہوجاتا ہے ایسے وقت میں اگر کہیں دُردانہ خانم (یہ ایک ایرانی ماما ہے جسے والد ماجد کربلائے معلےٰ کی زیارت سے واپسی کے وقت اپنے ساتھ لائے تھے، اور جس نے مجھے پالا ہے) کمرے میں آگئی اور اُس نے مجھ سے فارسی میں باتیں کرنی شروع کردیں، تو غیاث کا چہرہ پُرغضب ہوجاتا ہے، آنکھیں انگارا ہوجاتی ہیں۔ ایک دن تو برس پڑے۔ میں لکھنے کی میز پر بیٹھی تھی، پیاس معلوم ہوئی تو میں نے دُردانہ خانم کو آواز دی، اُس نے سُنا نہیں مجھے غصہ آگیا، تو میں پوری آواز سے چلائی:۔

"چاریک ساعت است، متصل صدا میکنم، کسے ملتفت نمی شود، پنبہ در گوش کردند مگر"۔

وہ نہ معلوم کب کے بھرے بیٹھے تھے، کہ دوسرے کمرے سے برس پڑے، کہنے لگے:۔

یا اللہ، ہمارے کو سمجھ میں نہیں آتا، اپن طہران میں ہیں کہ لندن میں، اتنا

سلہ ایک مشہور فرنگی گانے کے الفاظ

ہم کو سمجھ میں آتا ہے کہ ہندوستان میں نہیں ہوں۔"

میں چپ ہوگئی، اور سخت نادم ہوئی، مگر میرا قصور کیا تھا، خیر مگر آئندہ سے میں اُن کے سامنے دُردانہ خانم سے کبھی کسی کام کو نہیں کہتی ہوں۔

ایک دن خود لہریں جو آئے تو دُردانہ خانم سے فارسی میں گفتگو فرمانے لگے، مگر فارسی کے گلے پر وہ کُند چھری پھیری کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں اُٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ . . . .

سلمیٰ! سلمیٰ! آ میرے حال زار کو دیکھ! کھانے کے بعد متواتر زور سے ڈکار لینے والے آدمی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہوں کل جو خیال آیا تو دن بھر رویا کی، پیٹ پر ہاتھ پھیر کر "عا، عا" اونٹ کی طرح ڈکار لینا! اُف، غضب، غضب، یہ میں سوائے تمہارے کسی کو نہیں لکھ سکتی، اور اگر تم نے کوئی تدبیر نہ بتائی، تو تمہاری عذرا گھُل گھُل کر مر جائے گی۔ . . . .

ایک دن نہ معلوم کس طرح ادبیات کا ذکر آگیا، پوچھنے لگے۔ تمہارے کو اُردو کا کونسا شاعر اچھا معلوم ہوتا ہے؟ یہ ایسا بے ڈھب سوال تھا کہ میں بہت گھبرائی، صاف یوں ہے کہ میں نے اُردو کی ادبیات سے بہت ہی کم فایدہ اُٹھایا ہے، میں تو یہی سنا کرتی تھی کہ اُردو کی ادبیات بہت خراب ہیں، اخلاق بگاڑتی ہیں، مدرسے میں سوائے مولانا حالی کے (کہ اُن کا بھی کلام نہایت مختصر اور منتخب پڑھایا جاتا تھا) اور کسی شاعر کا نام سُنا نہیں بس میں نے بغیر اس خیال کے کہ دوسرے شاعروں سے مقابلہ کیا نہیں، یہ کہدیا:۔

"مولانا حالی کو"

"حالی کو پسند کرنے کی وجہ"؟

!!

؟؟

!!

سمجھیں؟ یعنی وہ ہمہ تن سوال تھے، اور میں ہمہ تن استعجاب" اور اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میرے پاس کیا جواب تھا کہ میں دیتی۔

آخر کہنے لگے :۔" میں حالی کو تو کچھ بھی نہیں پسند کرتا! ہم قافیہ نثر لکھتے ہیں۔ میرے کو "پیام یار" میں غزلیں لکھنے والے سب پسند ہیں، اور داغ کے کلام کا تو کیا کہنا، واہ واہ سب سے اچھا ہے، کیا ہجر، کیا وصل کی تصویریں ہیں، کیا معاملہ ہے، کیا چوچلا! آغا شاعر بھی بہت اچھا ہے"

پھر کہنے لگے :۔ یہ کیا بات ہے تم مدرسے میں پڑھی ہو؟ لیکن داغ کو نہیں جانتیں"۔

اس پر مجھے بھی غصہ آگیا، اور میں نے جواب دیا :۔ بیشک! لیکن آپ بھی تو شکسپیر اور ملٹن سے واقف نہیں"۔

اُنھوں نے تڑپ کر جواب دیا" میں انگریز ہوتا تو بیشک واقف ہوتا"۔ بس اس پر ہم دونوں چُپ ہوگئے، میرے ہونٹوں کو داغ نے سی دیا، اُن کے ہونٹوں پر ملٹن نے مُہر سکوت لگادی۔

غرض یوں بسر ہوتی ہے، میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی غیر ملک باشندے کیساتھ میری شادی ہوئی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستانی بی بی نہیں ملی۔

. . . .

ابا جان کی بے پروائی سے تم واقف نہیں! عجیب بے پروا آدمی ہیں! اماں جانی نمایش پرست، دولت پرست ہیں۔ میں یہاں کیوں بیاہی گئی؟ اس سوال

کے جوا

اسر

دھکیل دی

کنوئیں میں

اور میری پیٹھ

نہیں ؟ ہاں بشیلہ

بات یہ ہے کہ میں اب

کیا عجیب بات ہے'۔

حالت تربیت ایسی ہو کہ یہ کہا ج

رہے گا۔ وہی بدبخت' ناکام' ناشاد ر

کہ دنیا میں خوبی' امید و سعادت نہیں ہے' بر

ناقص ہے' ناکارہ ہے۔ بے علم ہے' وہ خوش قسمہ

شادمان' اور ہر طرح کی خوبی اُس کے لئے دوڑی ہوئی ا

فضل سے اچھے گھر میں پیدا ہوئی' اچھی طرح پلی' تعلیم پائی

تھے کہ کیا قسمت ہے' واہ ایسا بڑا گھرانا' ایسی بڑی ثروت' ایسو

یہ لڑکی بہت خوش رہے گی'' لیکن میں اسی حسرت میں مر رہی ہوں کہ

نے میری طرح اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی ہوتی' لیکن وہ ہیں کہ شام کو نوکر در

پر گالیوں کی بوچھاڑ' ناٹک کے گانوں کے عاشق زار' گھوڑ دوڑ کے' اور اُس میں

جُوا کھیلنے کے دلدادہ' یہ حالت دیکھ کر تمام امیدوں کا خون ہو جاتا ہے۔

میں خوش قسمت ہوں یا بد قسمت ؟ تمہیں ان تین مہینے کے واقعات جو میں

نے تمہیں لکھے ہیں پڑھ کر مجھے بتاؤ' اور یہ بھی بتاؤ کہ میں کیا کروں کس راستے

ور چونکہ
ہے حیدرآباد
س کی شکل کی
س کی تصویر ذہن
م ہوتا ہے' آواز
ی مونچھیں، چوڑی چوڑی
ور خوفناک اُس کے جسم
ع ہوگئی، دن کو جب وہ باہر
ے ان آنکھوں کا خیال کیا کرتی ہوں'
یاث مجھے بے انتہا بیتابی کے ساتھ چاہتا
ست ہوتی ہے' تم جانتی ہو کہ مجھے انسان کے
پسند ہیں' خدا نے اچھی آنکھیں کچھ عجب شئے بنائی ہیں'
ھیں ہی مجھے نفرت اور خوف دلا رہی ہیں۔
دکار' یہ آواز' "یہ دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے پری" کا عشق
ھتا کہ کہاں پناہ لوں۔
ب اُن کی طبیعت کا حال سنئے' انچلا خاموش کبھی بیٹھا ہی نہیں جاتا' ہر بات
میں دخل در معقولات کا بے انتہا شوق ہے۔ سیاہ ابر کی طرح گھر پر چھایا ہوا معلوم
ہوتا ہے بے انتہا باتونی' مگر شاید میں دسویں حصے کو بھی کان دھر کر نہیں سنتی' کیا
عمر بھر یوں ہی زندگی گذرے گی؟ میں اس بوجھ کو یوں ہی اُٹھاؤں گی' میں ایسے
خاوند کی تو تمنا نہ رکھتی تھی' ایسا خاوند نہ چاہتی تھی' مگر انسان جو نہیں چاہتا وہی

اُسے ملتا ہے۔
ممکن ہے کہ میرا جسم اُس کے جسم سے نفرت نہ کرے مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، کہ میری رُوح، میری طبیعت، اُس کی رُوح، اُس کی طبیعت سے ہمیشہ ہمیشہ اور پوری پوری نفرت کرے گی۔ باقی تم سے ملنے اور تمہیں ہزار بار چومنے اور زبانی دردِ دل سنانے کی تمنّا۔

تمہاری
عذرا

جواب

راولپنڈی۔ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء

میری شریر عذرا! تم نے اپنے خط میں عقل والی عورت بننے کی کوشش تو بہت کی لیکن ہر سطر سے صاف ٹپک رہا ہے:۔ کہ تم وہی شریر عذرا ہو۔
سب سے اول شادی کی دلی مبارک باد دیتی ہوں، یقین مانو، میں اپنی عمر کے چند برس اس بات پر فدا کرنے کو تیار ہوں کہ تمہارے سُرخ رخساروں کو جن پر تمہارے سیاہ بال آپڑے ہوں، دیکھوں، اُن رخساروں کو نہیں جو مدرسے میں تھے، بلکہ اُن رخساروں کو جنہیں ہوائے تاہل نے اور دمکا دیا ہوگا، آہ! پیاری عذرا تمہیں چومنے، دیوانہ وار چومنے کی اور تم سے چومے جانے کی تمنّا رکھتی ہوں، تو میں نے کاغذ پر اس جگہ ( ) کو چوما ہے اور میں خیال کرتی ہوں کہ میری رُوح محبت کا ایک ٹکڑا، اس جگہ چپک کے رہ گیا ہوگا، اس مقام کو تم بھی چومنا، تاکہ اسی طرح سے میرے ہونٹ تمہارے ہونٹوں سے ایک جگہ ملیں، اور میری رُوح کو مسرت پہنچے۔
تم نے اپنے خط میں کیا کیا لکھ ڈالا ہے۔ تمہارے خیالا

بعض اُن میں سے پراگندہ ہیں) تو مجھے حیرت میں ڈال دیا، تم نے خذف اور الماس کو خوب ملایا ہے۔

تمہارا خط پڑھتے وقت میں کس قدر ہنسی ہوں۔ میری شوخ، شاطر عذرا! اُسی پھڑک اُسی بھڑک، اُسی چنچل پن سے میری آنکھوں میں پھر گئی، وہی عذرا جو اپنی شرارتوں اور ہٹوں سے کبھی مجھے غصّہ دلا دیا کرتی تھی، اور کبھی بے تحاشا ہنسا دیا کرتی تھی۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں صرف ہنسی ہی ہنسی، یا میں تمہارے خط کو لاُابالی تحریر سمجھی، نہیں بجھے اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے حقیقت میں اپنا دردِ دل لکھا ہے، اور اس لئے میں نے تمہاری تحریر پر جدّاً نظر ڈالی اور کئی دن تک اسی کے متعلق سوچتی رہی، تمہاری اور اپنی حالت کا موازنہ کرتی رہی، میری اور تمہاری تربیت میں بہت ہی کم فرق ہے، ہم دونوں نے ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پائی، لیکن ہاں چونکہ میرے والد خود شاعر اور اُردو کے بڑے حامی اور دلدادہ تھے، اس لئے کچھ اُن کی کوشش سے، کچھ اپنے شوق سے، مجھے اردو میں تم سے زیادہ مصروفیت رہی اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی تو تمہارے برابر نہیں جانتی، مگر اُردو ضرور تم سے زیادہ جانتی ہوں، بولنے میں نہیں! کیونکہ تمہاری رواں اور پیاری زبان وہ بھی دلّی کی کہاں سے لاؤں، ہاں لکھنے میں، کیونکہ والد کے مضامین، اور اُن کے کتبخانے کی کتابیں اکثر پڑھتی رہی ہوں، اس لئے طبیعت تحریر کی اردو سے آشنا ہو گئی۔ پیانو، موسیقی، نقاشی، اس میں ہم دونوں برابر ہیں، پھر بیاہ کا زمانہ آیا، قسمت نے بیاہ کے قُرعہ میں میرے نام کے ساتھ، ولایت کے پاس شدہ انجینئر مسٹر حامد کا نام نکال دیا، تمہارے نام کے ساتھ نواب غیاث الدین نکلے، اور ہمارے ماں باپوں نے ہمیں اپنی آغوش سے جُدا کر کے اُن لوگوں کے دیا۔

اس مسئلہ ازدواج پر کچھ تھوڑا سا وعظ کہوں پہلے بیاہ شادیوں

میں کیا دیکھا جاتا تھا، یہی ناکہ برہم کف ہے یا نہیں، ایک برادری کا۔ ہے یا نہیں، اس کف اور برادری پر سب چیزیں قربان کردی جاتی تھیں۔ پھر اصلاح ہوئی، کف کا خیال ترک کردیا گیا، تعلیم کا زور ہوا، "بر، تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے، تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے" کا شور بلند ہوا، تھوڑے دنوں کے بعد اخلاق کی بھی چھان بین ہونے لگی، بس یہاں پہنچ کے اصلاح رخصت ہوئی، گویا اب کوئی کام باقی نہیں رہا، لیکن مجھ سے پوچھو تو کوئی کام ہوا ہی نہیں! اصلی اصلاح تو جب ہے، جب لڑکے لڑکی کے مزاج، اور طبیعت کی مناسبت کی پوری پوری چھان بین کی جائے، خلوند اور بیوی دوہرے کپڑے کی ابری، استر ہیں ابری، استر کے رنگ کی مناسبت کا کتنا خیال کیا جاتا ہے، یہ نہیں کہ دونوں ایک ہی رنگ کے ہوتے ہوں، نہیں، یک رنگی میں کوئی زینت نہیں، خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ایک رنگ دوسرے سے جوڑ کھاتا ہو۔

بس اسی طرح، لڑکے لڑکی کے مزاج کا خیال لازمی ہے، امتزاج کے اسباب موجود ہیں یا نہیں، طبیعتوں میں ایسا بیّن تضاد تو نہیں کہ میل کھانا مشکل ہو میرے نزدیک تو سب سے زیادہ اہم یہ سوال ہیں، حسن و جمال، مال دولت، تعلیم و تربیت سب کو میں دوسرے درجہ پر رکھتی ہوں۔

شاید تمہاری طبیعت اس وعظ سے گھبراتی ہوگی، میں معافی چاہتی ہوں، میں اس بحث کو ترک کئے دیتی ہوں۔ مگر کیسے ترک کروں، آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم جسے میں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ مزاج میں سنجیدگی نہیں، الھڑ ہے اور میں جسے تم ہمیشہ خیال پرست Sentimental شاعر مزاج کہا کرتی تھیں، ہم دونوں ایسے خاوندوں کے پالے پڑیں، کہ ان لوگوں کے ساتھ شادی نہ ہوئی ہوتی، تو وہ بھائی ہی ہوتے۔ ہم اُن کے پاس دس منٹ بیٹھنے سے گھبراتے او

ہمارے لئے ایسا ہی خیال رکھتے ہوں گے۔ یہ عدالت ہے، یہ انصاف ہے؟ کہو "ہاں" سوائے اس کے اور کچھ کہنا منع ہے، لیکن اس تضاد کا سبب کون ہے؟ اِن خرابیوں کا جواب دہ کس کو قرار دینا چاہیئے؟ میں تو بلا پس و پیش کہتی ہوں ہمارے ماں باپوں کو۔

اگرچہ خط لمبا کر کے تمہیں پریشان کروں گی لیکن میں بھی تمہیں اپنی زندگی کا مرقع دکھاتی ہوں، مسٹر حامد کیسے آدمی ہیں؟ اُن کے حسیات، اور خیالات کیا ہیں؟ افکار کیا ہیں؟ اُن کے حسیات اور خیالات یہ ہیں:۔ (۰ × ۰ = ۰)

آہ تم ایسا خاوند چاہتی تھیں، جو رات دن تمہارے ساتھ ہنسا کرے، تمہارے کھیلوں میں شریک ہوا کرے، مجھے ایسے شوہر کی تمنا تھی، جو کسی باز کے پنجہ میں پھنسی ہوئی چڑیا کسی پژمردہ گُل کو دیکھ کر میرے ساتھ روئے، میرے ساتھ ہردم عالم خیال میں رہے۔

حال یہ ہے کہ مسٹر حامد، جب رات کو گھر میں تشریف لاتے ہیں، تو اس خوف سے کہ کہیں اُن کی نیند نہ اڑ جائے، میری باتوں کا جواب بھی نہیں دیتے، اگر کسی دن تعطیل کے ایام میں، گھر میں کچھ ٹھہرے بھی، اور میں نے اُن کی خاطر کچھ بجانا شروع کیا، تو وہ فوراً آرام کرسی پر بیٹھ کر سونا شروع کر دیتے ہیں، اُن کے اوقات کا نقشہ تمہیں لکھتی ہوں:۔

سونا	۹ گھنٹے
سرکاری کام	۷ گھنٹے
سیر و تفریح و ریاضت	۶ گھنٹے
گھر میں	۲ گھنٹے
	میزان ۲۴

ذرا دیکھنا، ۲۴ گھنٹوں میں دو گھنٹے مجھے دیتے ہیں کہ اس حساب سے سال بھر میں میری اُن کی ملاقات صرف ایک مہینے ہوتی ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ ان دو گھنٹوں میں گھر کے معاملات، بچّوں کا دیکھنا بھی شامل ہے، غرض کہ مسٹر انجنیر نے یہ حساب پورا پورا بنا رکھا ہے، اور اس پر بہت باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔

عذرا! تمہیں بھی قسم ہے، اس تقسیم اوقات کے متعلق ذرا اپنی رائے دینا۔

گھر کے تمام انتظامات اور معاملات میرے متعلق ہیں، خانہ داری کے متعلق وہ کسی چیز میں پھنسا نہیں چاہتے ہیں، جو چاہوں کروں، مجھے پوری آزادی ہے۔ بچّوں کو پالوں، یا مار ڈالوں گھر تبدیل کر دوں، اسباب بیچ ڈالوں، اور خریدلوں، نوکروں کو مقرر کروں، برخاست کروں، غرض کہ جو چاہوں کروں، مختار ہوں۔

وہ گھر کو ہوٹل سمجھتے ہیں، اور کھانے پینے اور سونے کے لئے یہاں آتے ہیں، ان تیں باتوں کے انتظام میں وہ دخل نہیں چاہتے، اگر میں بیمار بھی پڑ جاؤں، تو اُن کے مقررہ اوقات میں فرق نہیں پڑتا، خود طبیعت ناساز ہو تو ظاہر ہے کہ اس دستورِ عمل میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

کم سخنی کا وہ عالم ہے کہ بات اُن کے دہان موزوں سے اوّل تو کم نکلتی ہے اور جب نکلتی ہے تو تُل تُل کے رتّی رتّی نکلتی ہے۔ میری تعلیم و تربیت معمولی تعلیم و تربیت نہ تھی، مدرسے کے علاوہ گھر پر بھی مجھ پر تربیت کی بوچھاڑ رہی، گورنس اور کیا، اور کیا، سب سے گھری رہی، پھر دُلھن بنی، اور ایسے شخص کو سونپی گئی، جو بڑا تعلیم یافتہ سات سمندر پار سے پڑھ کے آیا تھا، اور اللہ! کن کن امیدوں کے ساتھ، میں اپنے خاوند کے پاس گئی پہنچی تو عالم کچھ اور ہی پایا! کیا عالمِ امید اور عالمِ حقیقت، عالمِ خیالی اور عالمِ اصلی میں ہمیشہ اتنا فرق ہوتا ہے؟

حامد نے تمہارے خاوند کی طرح ہر دم میرے ساتھ رہنے سے مجھے پریشان

نہیں کیا، بلکہ وہ آزادی دی، جس سے میرے حق میں بے پروائی کی بو نکلتی تھی۔

تم جانتی ہو میں ایسی بدشکل تو نہیں، میری ملاقاتنیں اور آئینہ اس کی شہادت دیتے ہیں، جب یہ بات ہے تو کیوں میں اپنی تعلیم و تربیت و حسن کے شایاں، باکمال عفت زندگی بسر نہ کروں کیوں میری قسمت میں یہ بے پروائی لکھی ہوئی ہے؟ اسے سوچتے سوچتے میں کبھی چلا اُٹھتی، اگر یہی بے پروائی ہے، تو میں بھی ناولوں کی سی زندگی شروع کیوں نہ کردوں، یہ شخص جو میری تحقیر کرتا ہے اُس کا جواب تحقیر سے دوں"، میری معنویات، اور میری مادیات میرا بازو پکڑتے تھے، اور ایک اپنی طرف کھینچتی، اور دوسری اپنی طرف، آدھی رات تک اپنے خاوند کا انتظار کرتے ہوئے اپنی لڑکی کو تھپکاتی ہوئی، اس کشمکش میں رہا کرتی تھی، میں سوچتی تھی، کہ میں اپنے خاوند کی اسیر، اس کی باندی ہوسکتی ہوں مگر اُس کی طرف سے باندی کرنے کی کوشش تو دیکھوں وہ کیا فداکاری، محبت، مگر اس کا وہاں نام ونشان نہیں تھا، شاید میں نے پڑھا لکھا نہ ہوتا تو یہ خیالات میرے ذہن میں نہ آتے، شاید میری نظر سطحی ہوتی، اور اس لئے میں زیادہ متحمل، زیادہ صابر ہوتی، شاید میرے ذہن میں نہ آتا کہ حقارت کا مقابلہ حقارت سے کیا جا سکتا ہے، شاید میں یہ بھی نہ سمجھتی کہ میری حقارت کی جارہی ہے (مگر نہیں تعلیم نہ پاتی تو اور بھی زیادہ وحشی ہوتی، سوچنے، موازنہ کرنے، اور طبیعت کو روکنے کا مادہ نہ ہوتا)۔

ایک روز ایک عورت اپنا دکھڑا سنارہی تھی، میں نے ہمدردی کے طریقہ سے کہا، صبر کرو، صبر اچھی چیز ہے، وہ شکایت آمیز آواز سے کہنے لگی، "بیشک، صبر، مگر صبر کے بعد قبر"، سوچتی ہوں تو اُسے صحیح پاتی ہوں، انسان دو مرتبہ دُنیا میں نہیں آتا، شباب عود نہیں کرتا، فرض کرو کہ یہ بے اعتنائی میری طرف سے ہوتی تو کیا تمہیں شکایت کا موقع نہ ہوتا۔

یہ باتیں تمہیں لکھ رہی تھی کہ میری چھوٹی لڑکی جمیلہ دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور اپنی پیاری پیاری، ننھی ننھی آواز سے کہنے لگی:- "اماں جان! آج تم نے مجھے چوما نہیں" اور یہ کہہ کے کرسی پر چڑھ کر میری گود میں آ بیٹھی، اور اُس نے تمام میری دل کی جراحتوں پر مرہم کا کام دیا۔ عذرا! پیاری، خدا تمہیں بھی بال بچہ دے، اولاد بڑی نعمت ہے، ساری دنیا کے غم اُس کے سامنے بھاگ جاتے ہیں، اپنی بچیوں کو دیکھ کر یہ زندان، مجھے بہشت معلوم ہوتا ہے، یا میں اپنے تئیں ایک باغ تصور کرتی ہوں، جس میں یہ پھول کھل رہے ہیں، جُوں جُوں پھول کھلتے ہیں، باغ کی مسرت بڑھتی جاتی ہے۔

پیاری عذرا، میں دیکھتی ہوں کہ علم میں میرا خاوند چاہے مجھ سے بڑھ کر ہو چاہے میرے برابر، ایک بات میں تو قطعی طور پر میں اُس سے بڑھی ہوئی ہوں، اور وہ بات محبت اور شفقت ہے، میں اپنی بچیوں کو چومتے وقت اپنی محرومیت اور اپنی بدنصیبی سب بھول جاتی ہوں، حامد میں شفقت، اور محبت کا نشان تک نہیں۔ اُس نے نہ اقلیدس میں اسے پڑھا، نہ جبر مقابلہ میں اس نقطہ کو دیکھا، آج ان لڑکیوں کو لے کر چلی جاؤں، تو اگر میری ضرورت اُسے نہ ہو تو کبھی بھول کر بھی لڑکیوں کا خیال نہ کرے، میں نے ابھی کہا تھا کہ یہ حسِ شفقت میرے لئے اپنے خاوند پر تفوق کا باعث ہے، لیکن غور سے دیکھو، تو یہی تفوق میری اور کُل عورتوں کی ذلت کا باعث ہوتا ہے۔

حامد کو گھر میں اگر کسی چیز سے دلچسپی ہے تو اس سے کہ لڑکیوں کو نقشہ کشی سکھائے، کسی دن، تعطیل کا پورا دن اس میں صرف ہو جاتا ہے، بڑی لڑکی سعیدہ ابھی سال بھر ہوا علی گڑھ مدرسۂ نسواں میں بھیج دی گئی، وہاں لوگوں نے اس کی نقشہ کشی اور مصوری کی لیاقت دیکھ کر بہت تعجب کیا، کبھی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے جا کر انہیں بائیسکل پر چڑھنا سکھاتے ہیں۔

میں دعا کرتی ہوں ان دونوں لڑکیوں کی قسمت میری سی نہ ہو یہ تصویر کھینچنے والی، بائیسکل پر سوار ہونے والی لڑکیاں ساکن و راکد اور ٹھوس طبیعت والے خاندان کے پالے نہ پڑیں۔

بارہ برس سے میں حامد کی بی بی ہوں، مجھے تو یاد نہیں پڑتا مکانوں کے نقشے اور کھیلنے کے تاش کے علاوہ کوئی کاغذ میں نے اُن کے ہاتھ میں دیکھا ہو، نقشے کھینچنا، ایک، تاش کھیلنا، دو، یہ اُن کے شغل ہیں، کبھی کوئی بحث، کبھی کوئی بات، جس سے دل میں حرکت، دماغ میں چمک پیدا ہو، میں نے اُن سے نہیں سُنی۔ اُن سے ملنے دوست بھی آتے ہیں، تو چپکے چپکے تاش کھیل کے چلے جاتے ہیں۔ دُنیا میں انہیں کسی چیز کے متعلق جوش نہیں آتا۔ ان دو مشغلوں کے علاوہ دُنیا کے کسی واقعہ کا اُنکے دماغ میں گذر نہیں ہوتا، اُن کھیلوں، ان شغلوں کو بھی مقررہ اوقات میں کرتے ہیں، غرضیکہ اُن کا فلسفۂ حیات دنیا میں نباتات کی طرح خاموش زندگی بسر کرنا ہے، ہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ زندہ ہیں، کبھی کبھی تاش کھیل لینا ہے۔

وہ دن نہ بھولوں گی، کئی برس ہوئے، اس سکوتِ مطلق سے عاجز آ کر میں ایک دن اُن سے خوب لڑی، اس طرح:۔

"اس ٹھہرے پانی جیسی زندگی سے تو میں اکتا گئی، خدا کے لئے کچھ حرکت کرو، کوئی بات کہو، اور نہ سہی مجھ سے لڑو، شور مچاؤ، مجھے معلوم تو ہو کہ تمہاری رگوں میں خون دوڑتا ہے، اور میں ایک مرد کی رفیقہ ہوں، جاؤ کسی بیگانی عورت سے محبّت کرو، تا کہ اس حالت کو دیکھوں، اور اُسی طرح اس یک رنگ، یک آہنگ زندگی میں کچھ فرق آئے، ورنہ یہ مکان قبرستان سے بدتر ہو رہا ہے۔ یہ موت جیسی زندگی کب تک رہے گی، اچھا یہ نہیں تو آؤ مجھے مارو، میرے بال نوچو، آؤ کچھ تو کرو، میں کیا کیا تمہیں سُنا رہی ہوں، سنتے ہو، سمجھتے ہو کہ نہیں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں اس چیخنے چلانے سے تھک کر چُپ ہو رہی، مگر اُن کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا، نہ استہزاء، نہ غُصہ، نہ حِدت کہا تو یہ کہا (وہ بھی نہایت آہستہ سے) "ذرا میرا کوٹ لا دیجئے جمیل کے ہاں جانا ہے، اُن سے آج تاش کھیلنے کا وعدہ کیا تھا۔" یہ کہہ کے باہر چلے گئے۔ میں کرسی پر گر پڑی اور بڑی دیر تک رو یا کی۔

ساتھ اس کے یہ خیال رہے، وہ میری کسی طرح کھُلی کھُلی تحقیر، تذلیل نہیں کرتے، کبھی "تم" کا لفظ میں نے اُن کی زبان سے نہیں سُنا، ہمیشہ "آپ" کا استعمال کرتے ہیں، نہایت عزت اور احترام کا برتاؤ کرتے ہیں۔

لیکن یہ احترام کچھ مخصوص احترام نہیں، طبیعت کی اُفتاد اسی طرح ہوئی ہے، گویا ایک کل کا آدمی ہے جسے اسی طرح کی کوک ملی ہے، اور اُس کوک کے مطابق چل رہا ہے۔

باہر والے ہمیں سمجھیں گے کہ ہماری زندگی بڑی اچھی اور قابلِ رشک زندگی ہے، لیکن اگر اس پوشیدہ حقیقت کو دیکھیں تو ....

پیاری عذرا! تم نے اپنے خاوند کے حالات میں لکھا ہے، خاموش نہیں بیٹھا جاتا ہر بات میں دخل دیتا ہے، حرص بھری نظروں سے مجھے دیکھتا ہے، وغیرہ وغیرہ" میں اس کے جواب میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں، اس کی لالچی نظریں غرورِ نسوانی کے لئے غذا ہیں، میں تم سے کہتی ہوں، خوشی خوشی زندگی بسر کرو تمہاری اور تمہارے خاوند کی تربیت میں اختلاف ہے مزاج میں تھوڑا سا اختلاف ہے، مگر نہ اتنا کہ کوشش کرکے ایک دوسرے کے موافق نہ ہو جائے پس اُس کے ساتھ ہنسی خوشی بسر کرو، تمہارے خاوند کی ایک زندگی تو ہے، کچھ پرواہ نہیں اگر وہ شور مچاتا ہے، ٹھٹھا لگا رلیتا ہے، ناٹک کے گانے گاتا ہے، یہ باتیں اس قدر تحمّل فرسا نہیں، جیسی میرے گھر کی بے حرکت بے مآل زندگی۔ میں ان احترامات کی کیسے برداشت کروں، تمہیں یاد ہو گا شادی سے

پہلے میں کہا کرتی تھی کہ میں اپنے خاوند پر حکم کیا کروں گی، اُس کی آمر مجبر رہوں گی، لیکن اب دیکھو میرے تمام خیالات بدل گئے۔ میں چاہتی ہوں وہ میرا احترام کرے نہ کرے لیکن مجھ سے اپنا احترام کرائے، اور دل میں ایسا گھر کرے کہ چاہے مجھے اذیتیں دے لیکن میں اُس کی مطلوب مشتاق رہوں، اُن اذیتوں سے لذت اُٹھاؤں۔

اُف! سنسان، بے صدا جینا کچھ جینا نہیں، اُردو کا شکسپیر، غالب، کیا صحیح کہہ گیا ہے:- ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

سکون کی خواہش ہے تو اُس کے لئے قبر موجود ہے۔ مرنے سے کوئی روکتا نہیں، یہ سمجھ لو کہ فکر کی لذت، خیال کی لذت، شور و شغب کی لذت سے بڑھ کر ہے، مگر نہ حس نہ حرکت، نہ عالمِ خیال میں میرے ساتھ شرکت، نہ عالمِ وجود میں میرے ساتھ شرکت! اسکو زندگی کہتے ہیں؟

باقی تمہاری پیاری آنکھوں، تمہارے سیاہ بالوں، تمہارے سرخ گلگوں رخساروں سے، اشتیاق اور حسرت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں بوسے لینے کی آرزو!

تمہاری مفتون

ہلما (مخزن)

ہڈیوں کا پنجر

ربندرا ناتھ ٹیگور کے ایک افسانہ کا ترجمہ

(از جناب تیرتھ رام صاحب فیروز پوری)

(۱)

جب میں درسی کتابیں پڑھ چکا۔ تو میرے باپ نے مجھ کو فن طبابت سکھانا چاہا اور اس کام کے لئے ایک عالم بید کو استاد مقرر کیا۔ میرا نیا استاد صرف دیسی طبابت ہی میں ماہر نہ تھا۔ بلکہ ڈاکٹری بھی جانتا تھا۔ اور اس نے انسانی جسم کی بناوٹ سمجھانے کی غرض سے میرے لئے ایک انسان کا ڈھانچہ یعنی ہڈیوں کا پنجر منگا دیا تھا۔ جو اس کمرہ میں جہاں میں پڑھتا تھا رکھا گیا۔ عام لوگ جانتے ہیں کہ مردہ خصوصاً ہڈیوں کے ڈھانچہ سے کمسن بچوں کو جب وہ اکیلے ہوں کس قدر خوف آتا ہے۔ قدرتاً مجھ کو بھی ڈر لگتا تھا۔ اور شروع شروع میں میں کبھی اس کمرہ میں تنہا نہ جاتا تھا۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت کی وجہ سے جانا بھی پڑتا تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا ایک اور طالب علم بھی سبق میں میرا شریک تھا۔ جو بہت نڈر تھا۔ وہ کبھی اس ڈھانچہ سے خوف نہ کھاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس مشت استخوان کی بساط ہی کیا ہے۔ جس سے کسی زندہ آدمی کو تکلیف پہنچ سکے؟ ابھی ہڈیاں ہیں۔ چند روز بعد خاک ہو جائینگی۔ مگر میں نے اس بارہ میں کبھی اس سے اتفاق نہ کیا اور ہمیشہ کہتا رہا۔ کہ گو روح ان ہڈیوں سے جدا ہو گئی ہے۔ تاہم جب تک یہ موجود ہیں وہ وقتاً فوقتاً

آکر اپنے پرانے مکان کو دیکھا کرتی ہے۔ میرا یہ خیال بظاہر عجیب اور ناممکن معلوم ہوتا ہے اور کبھی کسی نے یہ دیکھا نہیں ہوگا۔ کہ روح پھر اپنی ہڈیوں میں واپس آگئی ہو لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میرا خیال درست تھا اور درست نکلا۔

(۲)

چند دن کا ذکر ہے کہ ایک رات خانگی ضروریات کی وجہ سے مجھے اس کمرہ میں سونا پڑا۔ چونکہ میرے لئے یہ نئی جگہ تھی۔ اس لئے نیند نہ آئی۔ اور میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ پاس کے گرجا نے بارہ بجا دیئے۔ لیمپ جو میرے کمرہ میں روشن تھا۔ مدھم ہونا شروع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ گل ہوگیا۔ اس وقت مجھے اس روشنی کی نسبت خیال آیا کہ ایک لحظہ پیشتر وہ روشنی تھی۔ مگر اب ہمیشہ کے لئے تاریکی میں بدل گئی ہے دنیا میں انسانی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ جو کبھی رات کو کبھی دن کو ابدی زندگی میں جا ملتی ہے۔

رفتہ رفتہ میرا خیال ہڈیوں کے ڈھانچہ کی طرف منتقل ہونا شروع ہؤا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ ہڈیاں اپنی زندگی میں کیا کچھ نہ ہوں گی۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہؤا۔ گویا کوئی متحرک چیز میرے پلنگ کے اِدھر اُدھر تاریکی میں پھر رہی ہے پھر لمبی سانسوں کی آواز۔ جیسے کوئی غمزدہ شخص سانس لیتا ہے۔ میرے کانوں میں پڑی اور پیروں کی آہٹ بھی آئی۔ میں نے خیال کیا یہ میرا وہم ہے۔ اور بدخوابی کی وجہ سے خیالی آوازیں آرہی ہیں۔ مگر پاؤں کی آواز پھر آئی۔ اس پر میں نے رفع شک کی خاطر زور سے کہا "کون ہے؟"

یہ سُنکر وہ نامعلوم شکل میرے پلنگ کے نزدیک آئی اور بولی "میں ہوں۔ میں اپنی ہڈیوں کو دیکھنے آئی ہوں"

میں نے خیال کیا میرا کوئی واقف مجھ سے ہنسی کر رہا ہے۔ اس لئے کہا "یہ

کونسا موقعہ ہڈیوں کے دیکھنے کا ہے۔ اصل مدعا کہو۔"

آواز آئی "مجھے وقت بیوقت سے کیا غرض۔ میری چیز ہے۔ میں جس وقت چاہوں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آہ! کیا تم نہیں دیکھتے۔ وہ میری پسلیاں ہیں۔ جن میں مدتوں میرا دل رہا ہے۔ میں پورے ۲۶ سال اس آشیانہ میں مقیم رہی ہوں۔ جس کو اب تم ہڈیوں کا ڈھانچہ کہتے ہو۔ اگر میں اپنے پرانے گھر کو دیکھنے چلی آئی۔ تو اس میں تمہارا کیا ہرج ہوا؟"

میں ڈر گیا۔ اور روح کو ٹالنے کے لئے کہا "اچھا تم جا کر اپنی ہڈیاں دیکھ لو۔ مجھے نیند آتی ہے۔ میں سوتا ہوں۔"

میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ جس وقت وہ یہاں سے ہٹی۔ میں فوراً بھاگ کر باہر چلا جاؤں گا۔ لیکن وہ ٹلنے والی آسامی نہ تھی اور کہنے لگی "کیا تم یہاں تنہا سوتے ہو؟ اچھا آؤ کچھ باتیں کریں۔"

اس کا اصرار میرے لئے آفت ناگہانی سے کم نہ تھا۔ موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مگر چار و ناچار جواب دیا "اچھا تو بیٹھ جاؤ اور کوئی مزیدار بات سناؤ۔"

آواز آئی "تو سنو۔ ۲۵ سال گذرے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح انسان تھی اور انسانوں میں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتی تھی۔ لیکن اب مرگھٹ کے ویرانہ میں پھرتی رہتی ہوں۔ آج میری خواہش ہے کہ میں پھر اس قدر عرصہ دراز کے بعد انسانوں سے باتیں کروں۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بھی میری باتیں سننے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ کیوں تم باتیں سننا چاہتے ہو یا نہیں؟"

یہ کہہ کر وہ اور آگے کی طرف آئی اور مجھے معلوم ہوا کہ کوئی شخص میری پائینتی پر بیٹھ گیا ہے اور اس سے پہلے کہ میں کوئی لفظ زبان سے نکالوں۔ اس نے

اپنا قصہ سنانا شروع کر دیا۔

اب کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے حوصلہ کر کے کہا "اچھا کوئی عمدہ کہانی سناؤ۔"

(۳)

وہ بولی "اے صاحب۔ جب میں انسانی جامہ میں تھی۔ تو صرف ایک شخص سے ڈرا کرتی تھی۔ اور وہ شخص میرے حق میں گویا موت کا فرشتہ تھا وہ میرا خاوند تھا۔ جس طرح ایک شخص مچھلی کو کنڈی لگا کر پانی سے باہر نکال لایا ہو۔ یہ شخص مجھ کو میرے والدین کے گھر سے لے آیا تھا۔ اور وہاں مجھ کو جانے نہیں دیتا تھا۔ شکر ہے کہ اس کا کام جلد تر ہو گیا۔ یعنے شادی کے دوسرے مہینہ ہی وہ دنیا سے چل بسا میں نے لوگوں کی دیکھا دیکھی نالہ و شیون کیا۔ لیکن دل میں بہت خوش تھی۔ کہ کانٹا نکل گیا۔ اب مجھ کو اپنے والدین سے ملنے کی اجازت مل جائے گی۔ اور میں اپنی پرانی سہیلیوں سے جن کے ساتھ میں کھیلا کرتی تھی۔ ملوں گی۔ لیکن ابھی مجھ کو میکے جانے کی اجازت نہ ہوئی تھی کہ ایک دن میرا خسر گھر میں آیا اور میرا چہرہ غور سے دیکھ کر اپنی اہلیہ سے کہنے لگا۔ مجھ کو قیافہ سے یہ لڑکی ڈاین معلوم ہوتی ہے۔ اپنے خسر کے الفاظ اب تک مجھ کو یاد ہیں۔ اور میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس کے چند دن بعد مجھ کو اپنے باپ کے گھر چلے جانے کی اجازت مل گئی باپ کے گھر پہنچ جانے پر مجھ کو جو خوشی حاصل ہوئی وہ احاطہ بیان سے باہر ہے۔ میں وہاں ہنسی خوشی رہنے اور اپنی جوانی کے دن گذارنے لگی۔ میں نے ان دنوں بارہا اپنی نسبت لوگوں سے سنا کہ میں خوبصورت نازنین ہوں مگر تم کہو تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا "میں نے تمہیں زندگی کی حالت میں دیکھا نہیں۔ میں کیسے رائے دے سکتا ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا۔ درست ہوگا۔"

وہ بولی "میں کس طرح یقین دلاؤں کہ ان دو خانوں میں دو سرگین آنکھیں دیکھنے

والوں پر بجلیاں گراتی تھیں! افسوس تم میرے اصلی تبسم کا اندازہ ان ہڈیوں کے کھلے منہ سے نہیں لگا سکتے۔ ان ہڈیوں کے گرد جو خوبصورتی تھی۔ اب اس کا نام تک نہیں ہے۔ میری زندگی کے ایام میں کوئی لایق سے لایق ڈاکٹر بھی گمان نہ کرسکتا تھا کہ میری ہڈیاں تشریح جسم انسانی کے کام آئیں گی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں چلا کرتی تھی۔ تو نور کی شعاعیں میرے بال بال سے نکلکر ہر سمت کو منور کیا کرتی تھیں۔ میں اپنے بازوؤں کو گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ آہ! یہ وہ بازو تھے۔ کہ جس کو میں نے دکھائے اپنا فریفتہ کیا۔ شاید سبھدرا کو بھی ایسے گول اور سڈول بازو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ میری چھوٹی نازک انگلیاں پنجہ مرجان کو شرماتی تھیں۔ افسوس میرے اس برہنہ ڈھانچہ نے تمہیں میرے حسن وجمال کی نسبت بالکل غلط رائے قایم کرنے کا موقعہ دیا۔ تم مجھ کو ایام شباب میں دیکھتے۔ تو آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی اور علم تشریح کا سودا دماغ سے حرف غلط کی طرح محو ہوجاتا۔"

میں نے جواب دیا۔ "یقین جانو تمہاری اس گفتگو سے بھی طب کے سارے معلومات میرے دماغ سے خارج ہوگئے ہیں۔ اور تمہاری دلکش خوبصورتی میرے دل میں نقش ہوگئی ہے۔ اچھا آگے کہو۔"

اس نے سلسلہ کلام جاری رکھکر کہا۔ "میرے بھائی نے فیصلہ کرلیا تھا۔ کہ شادی نہ کروں گا۔ اس لئے گھر میں صرف میں ہی ایک عورت تھی۔ میں شام کو اپنے باغ میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھتی۔ تو ستارے مجھ کو گھورا کرتے۔ اور ٹھنڈی ہوا جب میرے پاس سے گذرتی۔ تو میرے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی تھی۔ میں اپنے حُسن کے غرور میں بارہا سوچا کرتی کہ جس زمین پر میرا قدم پڑتا ہے۔ اگر اس میں محسوس کرنیکی قوت ہوتی۔ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ کبھی کہتی کہ دنیا کے سارے عاشق مزاج نوجوان گھاس کے بھیس میں میرے قدموں پر غلطاں پڑے ہیں۔ اب یہ تمام خیالات بار بار مجھ کو پریشان کرتے

ہیں کہ آہ! کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میرے بھائی کا ایک دوست ستیش کمار تھا۔ جس نے میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ وہ ہمارا بھی خانگی ڈاکٹر تھا۔ گو اس نے مجھ کو نہیں دیکھا۔ مگر میں نے ایک روز اس کو دیکھ لیا۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اسکی خوبصورتی نے مجھ پر خاص اثر کیا۔ میرا بھائی عجیب قسم کا شخص تھا۔ وہ زمانہ کے سرد گرم سے بالکل نا آشنا تھا۔ اور کبھی گھر کے کاموں میں دخل نہ دیتا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموشی پسند تھا اور تنہائی میں رہتا تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین بن گیا اور عارفانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ ہاں تو وہ نوجوان ستیش کمار اکثر ہمارے گھر آتا تھا۔ اور یہی ایک نوجوان تھا جس کو اپنے گھر کے مردوں کے سوا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ جب میں باغ میں تنہا ہوتی۔ اور پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے نیچے ملکہ کی طرح بیٹھتی تو ستیش کمار کا خیال اور بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتا۔ لیکن تم کس فکر میں ہو۔ تمہارے دل میں کیا گذر رہا ہے؟"

میں نے آہ سرد بھر کر جواب دیا "میں یہ خیال کر رہا ہوں کہ کاش میں ہی ستیش کمار ہوتا۔"

وہ ہنس کر بولی "اچھا پہلے میری کہانی سن لو۔ پھر عشق بازی کر لینا۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی مجھے قدرے بخار تھا کہ ڈاکٹر یعنی میرا پیارا ستیش کمار مجھے دیکھنے آیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بالمقابل دیکھا۔ اور دیکھتے ہی ڈاکٹر کو سکتہ سا ہو گیا اگرچہ میرے بھائی کی موجودگی نے اس کو ہوش سنبھالنے پر مجبور کیا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ میں ان کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آہستہ سے اپنا بازو دوشالہ سے باہر نکالا۔ ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھا۔ میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کہ کسی ڈاکٹر نے معمولی بخار کی تشخیص میں اس قدر تامل کیا ہو۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں سخت جدوجہد کے بعد اس نے میرے بخار کا اندازہ لگایا۔ لیکن میرا بخار دیکھتے دیکھتے

ہی بذات خود بیمار ہو گئے۔ کیوں تم اس بات کو مانتے ہو یا نہیں؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہاں بالکل مانتا ہوں۔ آدمی کی حالت میں تغیر پیدا ہونا کیا مشکل ہے۔"

وہ بولی "چند روز امتحان کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ میرے دل میں ڈاکٹر کے سوا اور کسی نوجوان کا خیال تک نہیں۔ میرا معمول تھا۔ کہ شام کے وقت بسنتی رنگ کی ساری پہنکر اپنے بالوں میں کنگھی کر کے پھولوں کا ہار گلے میں ڈالکر شیشہ ہاتھ میں لے۔ باغ میں چلی جاتی اور پہروں دیکھا کرتی۔ کیا شیشہ دیکھنا معیوب ہے؟"

میں نے گھبرا کر جواب دیا "نہیں تو۔"

اس نے سلسلہ حکایت کو جاری رکھ کر کہا "شیشہ دیکھ کر میں محسوس کرتی تھی۔ گویا میری دو زندگیاں ہو گئی ہیں یعنی میں خود ہی ستیش کمار بن جاتی اور خود ہی اپنے عکس کو معشوق سمجھ کر اس پر نقد دل نثار کیا کرتی۔ یہ میری بڑی مرغوب تفریح تھی۔ اور میں گھنٹوں اس میں گذار دیا کرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ دوپہر کو پلنگ پر بستر بچھا کر سوئی۔ اور ایک بازو کو بستر پر لاپروائی سے پھینک دیا۔ ذرا آنکھ جھپکی۔ تو خواب میں دیکھا۔ کہ ستیش کمار آیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیکر چلا گیا... بس اب میں کہانی ختم کرتی ہوں تمہیں تو نیند آ رہی ہے"

میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ اس لئے میں نے منت کے لہجہ میں کہا "نہیں تم کہے جاؤ۔ میرا شوق بڑھتا جاتا ہے۔"

وہ کہنے لگی "اچھا تو سنو۔ تھوڑے دنوں میں ستیش کمار کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ اور اس نے ہمارے مکان کے پچھلے حصہ میں اپنا مطلب کھول لیا۔ جب اسکو مریضوں سے فرصت ہوتی تو میں اس کے پاس جا بیٹھتی۔ اور ہنسی ٹھٹھے میں مختلف دواؤں کے نام پوچھتی رہتی۔ اس طرح مجھے کئی ایسی دوائیں بھی معلوم ہو گئیں۔ جو زہر قاتل تھیں۔ ستیش کمار جو کچھ میں اس سے دریافت کرتی۔ بڑی محبت اور متانت سے بتایا کرتا۔ اس طرح ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ اور

میں نے محسوس کرنا شروع کیا۔ کہ ڈاکٹر مفقود الحواس رہتا ہے۔ اور جب کبھی میں اسکے سامنے جاتی ہوں۔ تو اس کے چہرہ پر مردنی چھا جاتی ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اسکی کچھ وجہ معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکٹر نے میرے بھائی سے گاڑی مانگی۔ میں پاس بیٹھی تھی۔ میں نے بھائی سے پوچھا۔ ڈاکٹر اس وقت رات میں کہاں جائیگا؟ میرے بھائی نے جواب دیا۔ تباہ ہونے کو۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھ کو ضرور بتاؤ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بھائی نے کہا وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یہ سنکر مجھ پر غشی سی طاری ہوگئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بھائی سے پھر پوچھا۔ کیا سچ مچ وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یا مذاق کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا درست ہے۔ آج ڈاکٹر دلہن لائیگا۔

"میں نہیں بتا سکتی۔ مجھے یہ بات کس قدر شاق گذری۔ میں نے اپنے دل سے بار بار پوچھا۔ کہ ڈاکٹر نے کیوں مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی؟ کیا میں اس کو روکتی۔ کہ شادی مت کرو۔ ان مردوں کی بات کا کچھ اعتبار نہیں۔

"سہ پہر کو ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ کر مطب میں آیا۔ اور میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا یہ درست ہے کہ آج آپ کی شادی ہے؟ یہ کہہ کر میں بہت ہنسی۔ اور ڈاکٹر یہ دیکھ کر کہ میں اس کو ہنسی میں اڑا رہی ہوں نہ صرف شرمندہ ہوا۔ بلکہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔ پھر میں نے یکایک پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب جب آپ کی شادی ہو جائے گی۔ تو کیا آپ پھر بھی لوگوں کی نبض دیکھا کریں گے؟ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اور ڈاکٹروں کی نسبت مشہور ہے وہ جسم کے تمام اعضا کا حال جانتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ ڈاکٹر ہو کر کسی کے دل کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ کہ وہ کس حالت میں ہے۔ حالانکہ دل بھی جسم کا ایک حصہ ہے۔

"میرے الفاظ ڈاکٹر کے دل میں تیر کی طرح لگے۔ مگر وہ خاموش رہا۔"

(۴)

"لگن کی صورت بڑی رات گئے مقرر ہوئی تھی۔ اور برات کو دیر سے جانا تھا اسلئے

ڈاکٹر اور میرا بھائی حسب معمول شراب پینے بیٹھ گئے۔ اس شغل میں ان کو بہت دیر ہوگئی گیارہ بجنے کو تھے کہ میں ان کے پاس گئی۔ اور کہا ڈاکٹر صاحب گیارہ بجنے والے ہیں۔ آپ کو شادی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ وہ کسی قدر سرور میں ہو گیا تھا۔ بولا۔ ابھی جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے بھائی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اور میں نے موقعہ پاکر زہر کی پڑیا جو میں نے دوپہر کو ڈاکٹر کی غیر حاضری میں اسکے صندوق سے نکالی تھی۔ شراب کے گلاس میں جو ڈاکٹر کے سامنے رکھا ہوا تھا ڈال دی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر نے اپنا گلاس ختم کیا۔ اور دولہا بننے کو چلا گیا۔ میرا بھائی بھی اسکے ہمراہ روانہ ہوا۔

میں بالائی کمرہ میں گئی۔ اور اپنا نیا بنارسی دوپٹہ اوڑھا۔ ماتھے پر سیندور لگایا۔ اور پوری سہاگن بن کر باغ میں نکلی۔ جہاں روز شام کو بیٹھا کرتی تھی۔ اس وقت چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی اور چنبیلی کی خوشبو نے باغ کو مہکا دیا تھا۔ اب میں نے پڑیہ کی باقیماندہ دوا نکالی۔ اور منہ میں ڈالکر چلو بھر پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر میں میرے سر میں چکر سا آنے لگا۔ اور آنکھوں میں غنودگی چھا گئی۔ چاند کی چاندنی مدھم ہونے لگی۔ اور زمین و آسمان بیل بوٹے میرا گھر جہاں میں نے اس قدر عمر گذاری تھی۔ رفتہ رفتہ غائب ہوتے معلوم ہوئے۔ اور میں میٹھی نیند سو گئی۔

"ڈیڑھ سال کے بعد خواب راحت سے چونکی۔ تو میں نے دیکھا کہ تین لڑکے میری ہڈیوں سے علم تشریح سیکھ رہے ہیں۔ اور ایک استاد میری چھاتی کی طرف بید سے اشارہ کر کے لڑکوں کو مختلف ہڈیوں کے نام بتا رہا ہے اور کہتا ہے یہاں دل رہتا ہے جو شادی و غم کے وقت دھڑکا کرتا ہے۔ اور یہ وہ جگہ ہے جہاں اٹھتی جوانی کے وقت شگوفے نکلتے ہیں۔

"اچھا اب میری کہانی ختم ہے۔ اور رخصت ہوتی ہوں۔ سو جاؤ"

(افسانہ بنگال)

تخفیف جرم کی وجہ

فرانس کے شہرہ آفاق افسانہ نویس موسیو لیول کے ایک افسانہ کا ترجمہ

(از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے)

اخباروں کے ذریعے فرینکا اُس کو معلوم ہوا تھا کہ اُس کا بیٹا گرفتار کر لیا گیا ہے
پہلے پہل کسی طرح اُسے یقین نہ آتا تھا۔ کیسے آتا؟ بات ہی ایسی ہیبت ناک تھی۔
اُس کا بیٹا۔ ننھا سا بیٹا۔ اتنا خوش اطوار۔ ایسا شرمیلا۔ جو ابھی پچھلے ہی مہینے
ایسٹر کی تعطیل اسکے ساتھ بسر کر کے گیا تھا۔ چور اور خونی؟ ...... نظر آتا تھا۔
جیسے وہ سپاہیوں کی وردی پہنے پھر اس کے روبرو کھڑا ہے۔ اور اُس کے تروتازہ
اور گول گول چہرے پر محبت اور مسکراہٹ برس رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ
الوداع کہہ کر پھر اُس کے مرجھائے ہوئے رخساروں کو جوش سے چوم رہا ہے۔ بیٹے
کی یہ مسرت بخش اور فرحت انگیز باتیں یاد آئیں۔ تو وہ سر ہلا کر پھر کہنے لگی:۔
"خدا نہ کرے! وہ کیوں ہونے لگا تھا؟ کچھ غلطی ہوئی ہے۔ یہ کوئی اور ہوگا" مگر اسے
کیا کرتی۔ اخبار پر جلی حروف میں یہ عنوان لکھا تھا "ایک مجرم سپاہی" واقعہ ان ہی
بارکوں کا تھا۔ جن میں بیٹا رہتا تھا۔ اور ساتھ ہی اسکا پورا نام بھی درج تھا۔
مبہوت سی ہو کر کرسی میں دبک رہی۔ عینک کو پیشانی پر سرکا دیا تھا۔ ہاتھ ملا کر
بھینچ رکھے تھے۔ گرم گرم باورچی خانے میں سناٹا طاری تھا۔ اور اس کے کانپتے ہوئے
ہونٹوں سے معلوم ہوتا تھا کہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھیں کبھی

بوڑھے کتے پر گاڑ دیتی جو کھلے دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ کبھی لمبوترے کلاک کو تکنے لگتی جس کی سست رفتار ٹک ٹک بڑی متانت سے وقت کو گھسیٹے لئے جاتی تھی

کوئی گھر میں داخل ہوا۔ اضطراب سے چونک کر چلا اٹھی "کون ہے؟" دیکھا تو ہمسائی تھی۔ اپنی بیتابی کو چھپانا چاہتی تھی۔ بولی:۔

"میری آنکھ لگ گئی تھی ...... بڑی گرمی ہے ......"

عادتاً خلوت پسند اور خاموش تھی۔ پر آج برابر بولے چلی جاتی تھی۔ خود ہی سوال کرتی۔ خود ہی جواب دیتی۔ ڈرتی تھی۔ کہیں ہمسائی نہ اس سے کچھ پوچھ بیٹھے بے ربط فقرے بول رہی تھی۔ اور دماغ میں بس ایک ہی خیال گھوم رہا تھا "کہیں اسے معلوم تو نہیں ہو چکا؟"

آخر جب بولتے بولتے ہار گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا کہے۔ تو مجبوراً تھک کر چپکی ہو رہی ہمسائی نے کچھ عجیب سا منہ بنا کر کہا۔

"تمہیں اپنے بیٹے کی خیر خیریت مدت سے نہیں ملی؟"

"نہیں ــــ آج صبح ہی ملی تھی"

یہ نہ کہا۔ کیسے ملی لیکن کہتے کہتے ایک طوفان کی طرح دل میں یہ ارمان پیدا ہوا کہ جو شبہے میرے دل میں موجود ہیں۔ کوئی دوسرا ان کی تائید کر کے اطمینان دلائے۔ تشفی دے۔ کہیں سے کوئی ایسی آواز آئے جو میرے غم و غصے سے ہم نوا ہو کر کہہ رہی ہو "کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تمہارا بچہ کیوں ہونے لگا تھا ــــ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے"

اخبار ہمسائی کی طرف بڑھا دیا۔ اور دلجمعی سے کہنے کی کوشش کی:۔

"تم نے یہ بھی دیکھا ...... عجب پہیلی ہے۔ ہے نہ؟"

گلا سوکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ ساتھ ہی بولی:۔

"کیسی پگلی ہوں ..... پہلے پہل دیکھا۔ تو میرے تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی ..... سٹھیا گئی ہوں ....."

ہمسائی اب بھی گم سم بیٹھی رہی۔ بڑھیا نے کہا:—

"پر ہے کیسے اچنبھے کی بات۔ ہے نہ؟ ..... بڑے ہی اچنبھے کی بات ہے"

"ہاں عجیب ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایک ہی رجمنٹ میں ایک نام کے دو آدمی ہوں"

بڑھیا نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ بولی "ہاں یہی تو میں کہتی ہوں ..... یہیں تو پانی مرتا ہے ..... اس نام کے دو آدمی ..... پھر میرے بچے کا ذکر تھوڑا ہی ہے ....."

ہمسائی بولی "اللہ جانے کیا قصہ ہے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ اسی لئے تم سے پوچھ رہی تھی ..... ہماری تو یہی دعا ہے کہ ..... وجہ یہ کہ تمہارا بیٹا ہوا تو پھر ..... اب لوگ ہی کہتے ہیں۔ کو پر کے ہاں بھی اسی نے چوری کی تھی ..... وہ اُن دنوں میں سو فرینک کی چوری ہوئی تھی نہ جب وہ ایسٹر پر گھر آیا ہوا تھا"

ماں تن کر کھڑی ہو گئی مٹھیاں بند تھیں۔ غصے کے مارے چہرہ ایسا پھیکا پڑ گیا تھا گویا موت کی تصویر بن گئی ہے۔

"کسے یہ کہنے کا حوصلہ ہوا! ..... اُس نے ہرگز چوری نہیں کی ..... ہرگز نہیں ہرگز نہیں! ..... شرم نہیں آتی تمہیں؟ ..... ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ دنیا بھر کے الزام ہمارے سر تھوپ رہی ہو ..... میرا ننھا دھیا لال! اچھی بات۔ ایک روز تم سب کو معلوم ہو جائیگا ....."

نہ گھر کا دروازہ بند کیا۔ نہ بوٹ پہنے۔ بڑی تیزی سے قریب بھاگتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کو چلدی۔"

شہر پہنچی تو سات کا گھڑیال بج رہا تھا۔ ریل میں اس کے دلی خدشے کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے اب دل یہ نہ کہہ رہا تھا "یہ ناممکن ہے!" کہتی تھی ہے ہے اور اگر سچ ہوا تو!..." معلوم ہوتا تھا۔ سفر کبھی تمام نہ ہوگا گاؤں اور کھیت نظروں کے سامنے دیوانہ وار بھاگے چلے جا رہے تھے۔ تار کے کھمبے یوں اُبھرتے ہوئے نظر آتے۔ اور ڈوب ڈوب جاتے۔ جیسے وہ ہنڈولے پر سوار ہو۔ جب ٹرین تھم گئی تو وہ کانپنے لگی۔ اب معلوم ہو رہا تھا۔ کہ حقیقت معلوم ہو جانیکا وقت بہت جلد آگیا مُنہ ہی مُنہ میں اوراد و وظائف دُہرا رہی تھی۔ دعائیں خود بخود زبان پر چلی آ رہی تھیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ وہ التجائیں بھی کرتی جا رہی تھی:۔

"پاک مریم۔ تیرے ہوتے یہ ستم کیوں کر ممکن ہے نہیں ممکن ہے نہ؟... میری دُکھ بھری دعاؤں کو سُن۔ جو میں تیرے حضور میں لائی ہوں"

آہنی دروازے میں سے گذرنے کے بعد سامنے چوکور پارک نظر آئی۔ اس کے سامنے دور دور تک میدان پڑا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف سکون اور خاموشی تھی سپاہی سیڑھیوں پر بیٹھے مزے میں باتیں کر رہے تھے بیٹے نے ماں کو مختلف عہدے داروں کی پہچان بتا دی تھی۔ وہ ایک سارجنٹ کے پاس آکر تھم گئی۔ بڑی عاجزی سے بولی:۔

"میاں سارجنٹ۔ کھوگے تو۔ نہ جان نہ پہچان۔ پر مجھے ایک بات دریافت کرنی ہے۔ معلوم کرنا چاہتی ہوں...."

گو مگو کے عالم میں کچھ رُکی۔ اپنے شبہوں کے اظہار کی جرأت نہ تھی۔

"وہ یہ بات ہے۔ بات کیا ہوتی۔ اپنے بیٹے کا حال پوچھنا ہے.... جولز شان تیسری رجمنٹ میں ہے نہ.... میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ..... بس یہ کہ میں اس سے مل سکتی ہوں....؟"

بُڑھیا نے مُسکرانے کی کوشش کی۔

"میں اس کی ماں ہوں ..... اس کی ماں .... نہیں؟ پر کیوں؟ .....
کہاں ہے؟ ...... بیمار ہے کیا .... تو پھر کیوں نہیں؟ ......
ہاں مجھے معلوم ہے ..... نہایں مجھے تو خبر نہیں .... گرفتار ہوگیا ......
پولیس اسٹیشن پر ہے؟ ..... نہیں؟ ..... قید میں ہے قید میں ..... تم نے کیا
کہا؟ ...... ؟"

بُڑھیا نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔

"پاک مریم۔ پھر یہ سب کچھ سچ ہے! ہائے پاک مریم ....."

لڑکھڑا لڑکھڑا کر قدم دھرتی ہوئی واپس چلی۔ فوجی جیل سے معلوم ہوا کہ بیٹے کو قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے "اس تنہائی" کے لفظ نے اس کے خدشوں کو بیحد بڑھا دیا اس کے تصور میں آیا جیسے وہ اکیلا ہے۔ اور ہر ایک سے ہمیشہ کے لئے جُدا کر کے بند کر دیا گیا ہے۔ جکڑ دیا گیا ہے۔ وہاں لوگوں نے مشورہ دیا۔ کہ کسی وکیل سے جا کر مل۔ اسی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے ایک وکیل کے ہاں گئی۔ اور اس سے ملی۔ وکیل سے تمام معاملہ ٹھیک ٹھیک معلوم ہوگیا۔ اب کچھ شبہ باقی نہ رہا تھا۔ لڑکے نے لوٹنے کی نیت سے کسی کو جان سے مار ڈالا تھا۔ مال مسروقہ۔ تقریباً چھ سو فرینک۔ اس کی توشک میں سے برآمد ہوگئے تھے۔ لڑکے نے اقبال جرم کر لیا تھا۔ بہتیرے آنسو بہائے۔ بیٹے سے مل لینے کے لئے منتیں خوشامدیں کیں۔ مگر بے سود۔ مجبوراً گاؤں کو واپس چلی گئی۔

سب کو معلوم ہو چکا تھا دل دھڑکتا تھا۔ کہ نہ جانے کوئی کیا کہہ دے۔ لوگوں سے نظریں چار کرنے کے خیال سے وحشت ہوتی تھی۔ آدھی رات تک گھر میں داخل نہ ہوئی۔ مسکین جانور کی طرح جو مار سے ڈرتا ہے اور چھپ رہتا ہے۔ اب باہر آنے جانے

کی بھی جرأت نہ پڑتی تھی۔ گھر کی کھڑکیوں کے پردے کھینچ دئے تھے اخبار والا اخبار دروازے کے نیچے سے اندر ڈال جاتا۔ کانپتی کانپتی اُسے اُٹھا لیا کرتی۔ اخباروں سے اسے نہ صرف اس جرم کی تفصیل معلوم ہوئی۔ بلکہ یہ اطلاع بھی ملی۔ کہ بیٹا ایک اور جرم کا ملزم بھی ٹھیرایا گیا ہے۔ شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی معلوم ہوتی تھی۔ کہ اُس نے کوپر کے ہاں بھی چوری کی تھی۔ لیکن یہ ـــــ ہرگز نہیں۔ وہ قسم کھا سکتی تھی یہ غلط تھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن آخرکار اسے اس میں بھی کچھ تامل سا ہونے لگا۔

مہینہ ہونے کو آیا۔ تو پھر وکیل کے پاس گئی۔ اب اس نے بیٹے سے ملنے کی درخواست نہ کی۔ خدا نہ کرے کچھ اس لئے نہیں کہ بیٹے سے محبت ختم ہو چکی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اسے شرم سی آتی تھی۔ ۔ ۔ ۔

"موسیو۔ وہ اس سے کیا سلوک کرینگے۔ آپ اُنہیں میرے بیٹے کو مجھ سے چھین کر تو نہ لیجانے دینگے۔ ۔ ۔ ۔"

"بدنصیب عورت۔ مجھے تو ڈر ہے۔ وہ اسے لیجائینگے کاش تخفیفِ جرم کی کوئی وجہ نکل آتی۔ پھر سب کچھ ہو جاتا۔

"یہ کیا بات ہے؟ کوئی وجہ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"اس کا مطلب ہے کوئی ایسی بات جو جج کی نظروں میں جرم کو گھٹا دے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو۔ کہ ایک شخص چوری کرتا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اسنے چوری اس لئے کی کہ وہ بڑی غربت کی حالت میں تھا اور اُس کے بال بچوں پر فاقے گذر رہے تھے۔ تو یہ بات تخفیف جرم کی وجہ بن جاتی ہے۔ اس معاملے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ پھر یہ لڑکے کا پہلا جرم بھی نہیں وہ دوسری چوری۔ خواہ وہ نہ مانے۔ مگر اب جو بات ہے تاہم جو کچھ ہو سکتا ہے میں کرونگا۔"

فرینکائس اور بھی زیادہ ملول و دل شکستہ ہو کر گئی تخفیف جرم کی وجہ۔ ان

لفظوں نے اس کے دل کو کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کسی طرح سے کہاں سے کوئی ایسا بہانہ ملے۔ جس سے ججوں کے دل پر اتنا اثر ہو سکے کہ وہ رحم اور عفو پر مائل ہو جائیں ...... کوئی نہیں۔ اسے جرم کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کوئی چیز اس بھیانک واقعہ پر اثر نہ ڈال سکتی تھی۔

مقدمہ کا دن آیا پھر گھر سے چل کھڑی ہوئی۔

ریل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ بزرگان دین کی دہائی دے دے کر ان سے امداد طلب کر رہی تھی اور خالی دماغ میں وہی لفظ ہوا بر گونج رہے تھے۔ جنہیں بار بار دُہرا چکی تھی "تخفیف جرم کی وجہ ...... تخفیف جرم کی وجہ"

وہ گواہوں کے ساتھ ایک بند اور اندھیرے کمرے میں تصویر انتظار بنی کھڑی تھی۔ گواہوں نے اسے موجود دیکھ کر آہستہ آہستہ گفتگو کرنی شروع کر دی۔ جب اسکی باری آئی تو وہ ڈگمگاتے قدموں سے عدالت کے اندر داخل ہوئی۔ صاف اور تیز روشنی میں اس کی پلکیں بار بار بند ہوتی اور کھلتی تھیں۔ پل بھر میں نظر بیٹے پر پڑی۔ اس نے ایک رومال پر جس میں بڑے بڑے نیلے خانے پڑے تھے۔ سر رکھا ہوا تھا اور چھوٹی چھوٹی مگر زور زور کی سسکیاں لے رہا تھا ...... بڑھیا تن کر کھڑی ہو گئی اور جج سے نظریں ملائیں۔

اس نے خود شہادت دینے کی التجا کی تھی۔ لیکن اب حیرت کے عالم میں گم سم کھڑی سوچ رہی تھی۔ کہ تو نے کیوں شہادت دینے پر اصرار کیا تھا۔ تجھے تو اس معاملے کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ تجھے تو کچھ بھی نہیں کہنا۔ تو یہاں آئی کیوں۔ کوئی بھی تو وجہ نہیں ہے تو بس صرف یہ کہ تو اس کی ماں ہے۔ تو ہی نہیں۔ جو اسے پیٹ میں لئے پھرتی تھی۔ تو نے ہی تو اس کے لئے دکھ درد سہے۔ اسے پالا پوسا ...... پروان چڑھایا ...... یہ تیرا۔ سب کا سب تیرا نہیں ہے؟ نہیں۔ اب نہیں۔ آج یہ تیرا نہیں رہا۔

وہ تمام سوالوں کا جواب اشاروں کے ذریعے اور مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بول کر دیتی رہی۔ عدالت میں غضب کا سناٹا طاری تھا۔ غریب دیہاتن سیاہ لباس پہنے غم کے مارے جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ جو کوئی اسکو دیکھتا اسکا دل دُکھ کے رہجاتا جج نے پوچھا "یہ تمہارا اکلوتا بیٹا ہے؟"

"جی حضور"

"جب یہ تمہارے ساتھ رہتا تھا۔ تو تمہیں کبھی اس سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تھی؟"

"کبھی نہیں حضور"

"اس کے ملنے جُلنے والوں میں کوئی بدمعاش لوگ بھی تھے؟"

"کوئی نہیں۔ اس کے باپ کو سب لوگ بہت چاہتے۔ اور اُس کی عزت کرتے تھے۔ وہ یہ کب گوارا کر سکتا تھا۔ نہ مجھے ہی یہ گوارا ہو سکتا تھا.... سب کے دل میں ہماری عزت تھی....."

"ہمیں معلوم ہے.... ہمیں معلوم ہے"

پھر جج نے ملزم کی طرف رُخ کر کے کہا:۔

"تمہیں بھی یہ معلوم تھا۔ اور اسی لئے تم نے اپنے والدین کی شہرت کی آڑ لے کر ان دنوں کو چوری کے لئے مناسب سمجھا۔ جب تم اپنی ماں کے پاس مقیم تھے..... ایسے ایماندار لوگوں کے بیٹے پر کون شبہ کر سکتا تھا.... کوئی دوسرا ہو تو یہ کہہ سکتا ہے اُپنے جرم کا پورا ذمہ وار میں نہیں ہوں۔ میں ایسے لوگوں کے ساتھ رہتا تھا جو میرے سامنے بُری نظیر پیش کرتے تھے، لیکن تم۔ تم اس قسم کا کوئی عذر نہیں کر سکتے"

یہ سُنکر بڑھیا بیتاب ہو گئی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جو رُو رُو کر سوج گئی تھیں۔ ایک عجیب قسم کی روشنی سی چمک اُٹھی۔ سر جُھکا ہُوا تھا۔ بغیر کسی قسم کا اشارہ کئے اچھی خاصی پُرزور آوازیں بولنے لگی۔

"موسیو مجھے معاف کرنا۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ سچ بولنے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں۔ یہ دکھیا بچہ گنہگار ہے۔ اس نے بہت بڑا جرم کیا ..... لیکن یہ جرم اس اکیلے نے نہیں کیا .... ابھی ابھی مینے کہا تھا۔ میری زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں جس پہ مجھے لعن طعن کی جاسکے ..... میں نے جھوٹ بولا تھا وہ کوپر کے تین سو فرینک میں نے چرائے تھے۔ میں نے .... جب میرا جولز ایسٹر میں گھر آیا۔ تو میں نے اسے بتا دیا کہ میں نے چوری کی ہے یہ غریب اتنا سُن کر سہم گیا ..... بچہ ہی تو ہے .... دیکھا۔ کہیں ماں اپنی عزت اور شہرت نہ گنوا بیٹھے .... بس وہ روپیہ لوٹانے کو اور مجھے گرفتاری سے بچانے کو اس نے دوسری جگہ چوری کی ..... پکڑا گیا ..... ہوش و حواس قایم نہ رہے ...... بغیر سمجھے بوجھے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار بیٹھا۔"

بُڑھیا کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ذرا دیر چُپ رہی۔ پھر مدھم آواز میں بولی:۔

"میں نے جھوٹ بولا تھا .... میں بدحواس عورت ہوں۔ میں نے اپنے بچے کے سامنے بُری نظیر پیش کی ..... وہ تو میں ہوں جسے آپکو گرفتار کرنا چاہیئے ... حضور یہ بات اس کے تخفیف جرم کی وجہ ہو سکتی ہے .... ؟ مجھ کو بخش دیجئے۔"

وہ اور بھی جُھک گئی۔ کندھے نیچے کو ڈھلک گئے۔ سر اور جُھک گیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ مُسکڑ کر نابود ہوئی جا رہی ہے۔

..... لڑکے کی سزا عمر قید بڑھی گئی" بُڑھیا تمام گاؤں میں ہدف ملامت بن کر تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی۔ گاؤں والوں نے رواروی میں نماز جنازہ ادا کرکے اُسے قبرستان کے سب سے دور کے حصے میں دفنا دیا۔ ایسے کونے میں اس کی قبر بنائی کہ سورج سر پہ ہو۔ جب بھی گرجا صلیب کا سایہ اس تک نہیں پہنچنے پاتا۔

"میں نے یہ کہانی اُس کی قبر پر سُنی تھی۔ سیدھی سادی قبر تھی۔ اس پر کسی قسم

کی آرائش نہ تھی۔ صرف سیاہ لکڑی کی ایک سرد و گرم صلیب نصب تھی۔ اور زنگ خوردہ دانوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی اور مڑی تڑی تسبیح اوپر پڑی تھی۔ جس کے ساتھ ایک کاغذ پر یہ الفاظ لکھے تھے۔ جو میں نے پڑھ لئے۔

"فرنیکائس حشان کو۔ اس جج کی طرف سے۔ جس کے سامنے اُس کے بیٹے کا مقدمہ پیش ہُوا تھا۔"

(نیرنگِ خیال)

صحیح غلطی

(از جناب لطیف الدین احمد صاحب۔ آگرہ)

شاہزادی نے ایک ایسے باغ کی طیاری کا حکم دیا جو تخیئل شاعرانہ کا بہترین مظہر ہو' چنانچہ اسکے ذوق وشوق کی تمام رعایتیں مدنظر رکھتے ہوئے ایک نہایت دلکش ونظر فریب باغ طیار کیا گیا' شاہزادی کو اطلاع دیگئی اور وہ سراپا شوق ومسرت بنکر اُس کے معائنے کے لئے گئی' لیکن باوجود کمال حسن وتزئین اُسے سارا باغ کچھ بے روح سا نظر آیا' یہ احساس اُسکی افسردگی کا سبب ہؤا اور وہ کچھ مغموم اور متامل نظر آئی' کچھ وقفے خاموش رہنے کے بعد اُسنے کہا" اس باغ وعمارت کی روح اُسوقت تک شگفتہ نہیں ہوسکتی جب تک یہ کسی دیوتا کے نام پر وقف نہ کیا جائے اور اُس کا مجسمہ یہاں نصب نہ ہو" مصاحبین ومنتظمین نے شاہزادی کا رجحان طبع معلوم کرکے مختلف دیوتاؤں کے بت قائم کئے جانے تجویز کئے مگر شاہزادی کو کسی کی رائے سے اتفاق نہ ہؤا' اور اُس نے ہر تجویز میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر مسترد کردیا' کیونکہ اُسکی خواہش تھی کہ وہ باغ ہمیشہ بہار رہے' اور جتنے نام تجویز ہوئے تھے ان میں سے کسی دیوتا میں یہ خصوصیت نظر نہ آتی تھی جو ہمیشہ مسرور وشاداں رہ سکتا ہو۔

"یہاں دوستی کے دیوتا کا بت نصب کیا جائے" شاہزادی نے کمال غور وفکر کے بعد حکم دیا' "دوستی کے دیوتا کے علاوہ سب کو زوال ہے' اور میں چاہتی ہوں کہ اس باغ میں کبھی خزاں نہ آئے" سب نے اس انتخاب کی بیحد تعریف کی اور کلی

اتفاق کا اظہار کیا۔

ایک مشہور صنم ساز کا انتخاب ہوا، اور اُس نے اپنی ساری نازک خیالی و چابکدستی صرف کر کے دوستی کے دیوتا کا ایک نہایت حسین بت بنا کر پیش کیا، مگر شاہزادی نے جس کا دل محشرستانِ آرزو تھا، دوستی کے اس مجسمہ کو پسند نہ کیا اور صناع سے کہا "یہ مجسمہ تو متانت و سکون کا مظہر ہے؛ میں تو چاہتی تھی کہ وہ بہجت و شادانی کا مرکز ہو۔ یہ دوستی کا صحیح مجسمہ نہیں ہو سکتا!"

صناع نے ہر چند اُسے باور کرانا چاہا کہ ازروئے رعایات و صنعت وہ صحیح اور حسین ترین بت بنا کر لایا ہے اور اُسے وہ اپنی دستکاری کا شہ پارہ سمجھتا ہے، مگر شاہزادی اسے مان نہ سکتی تھی،

"میں خود تمہارے صنم خانہ میں چلکر انتخاب کرونگی۔" اس نے کہا! اور وہاں جاکر چھوٹے بت کو جو گلاب کے پھولوں میں تبسم کناں سو رہا تھا اور خود بھی گلاب کا ایک شگفتہ پھول معلوم ہوتا تھا منتخب کر لیا اور کہنے لگی "دوستی کے معبد میں اس مجسمہ کے علاوہ اور کون ایسا ہے جو اُسے ہمیشہ خنداں و فرحاں رکھ سکے :۔ اسکے تبسم کی سمن فشانیوں سے باغ کی روح ہمیشہ مسرور شگفتہ رہیگی اور خزاں کو کبھی دخل نہ ملیگا!"

جب شاہزادی اُس مجسمے کو لیکر چلنے لگی تو صناع مسکرایا، شاہزادی نے اُسکا تبسم دیکھا اور وجہ دریافت کی، صناع نے ہر چند ٹالنا چاہا مگر شاہی دوشیزہ کی ضد قایم رہی صناع نے کہا "ایک دوشیزہ کے لئے مشکل تھا کہ وہ دوستی کا مجسمہ لینے آئے اور محبت کا پیکر نہ لیجائے!" شاہزادی یہ سنکر صرف مسکرا دی!

(نگار)

قطرہ میں طوفان

(از جناب حامد اللہ افسر صاحب بی۔ اے میرٹھی)

(۱)

مدنی کے کتب خانہ کی ہر کتاب پر طرزی کی نظر ٹھوکر کھاتی تھی، کیسا بیش قیمت مجموعہ ہے۔ اس شخص کی زندگی قابلِ رشک ہے، ایسی نایاب کتابیں جس کے قبضہ میں ہوں پھر اُسے دنیا میں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

سورج کی آخری کرنیں کمرے کی سفید دیواروں پر نور برسا رہی تھیں۔ نظر پڑتے ہی پھلتی تھی۔ مارچ کا مہینہ بھی کیسا عجیب اور پُرلطف مہینہ ہوتا ہے۔ اور پھر نورنگر کی سر زمین، حقیقت یہ ہے کہ ہوا کا ہر جھونکا فطرت کی عیش پرستیوں کا اثر لئے ہوئے تھا۔

جس وقت طرزی ایک قدر شناس کی نگاہ سے کتابوں کی پشت کے سُنہری حرفوں کے پڑھنے میں مصروف تھا مدنی کی نظر اُس کی بلند اور نازک گردن پر پڑی۔ ذرا سے اشارے میں کیا کچھ ہوسکتا ہے! کیسا دل خوش کن خیال تھا!

مدنی اور طرزی دونوں دوست تھے، آج کے نہیں بیس سال کے دوست تھے، دونوں ادیب اور دونوں شاعر تھے۔

طرزی بہت حساس تھا، وہ برداشت نہ کرسکتا تھا کہ اُس کے کسی دوست کو اُس کی نسبت کوئی بدگمانی یا غلط فہمی پیدا ہو۔ اور اگر پیدا ہوجائے تو اولین موقعہ پر اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی خیال آج اُسے بمبئی سے نورنگر تک کھینچ لایا۔

طرزی کو فضا کی ہر چیز سے محبت تھی، وہ چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز اس سے محبت کرے شاید یہی وجہ تھی کہ طرزی ایک مقبول مصنف تھا، دنیا اُس کی قدر کرتی تھی اور اُسکی زندگی ایک کامیاب زندگی سمجھی جاتی تھی،

مدنی کے دماغ میں اس وقت خیالات کا ایک حشر برپا تھا، "اُس کمبخت نے میری زندگی تباہ کردی اُس نے ہمیشہ میری ترقی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ میری ناکامی اور میری کس مپرسی کا سبب ہوا دکھاوے کے لئے ظاہرداری کے واسطے میرا مربی میرا معاون میرا مددگار کیا کیا نہ بنا مگر صرف لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ طرزی مدنی کو ایک نہایت معمولی آدمی سمجھتا ہے، اُف کسقدر خودبین، کسقدر، خودپسند کسقدر مغرور ہے، میں سب جانتا ہوں۔ میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں، مجھ پر تیرے سیاہ اور کثیف دل کا حال روشن ہے۔"

مدنی کے خیالات مبالغہ میں ڈوبے ہوئے سہی مگر حقیقت سے زیادہ دور نہ تھے۔ ایک حد تک یقیناً طرزی اُسکی ناکامیوں کا باعث ہوا۔ لاہور کے مشہور رسالے "سروش" کی ایڈیٹری کے لئے جب مدنی رسالے کے مالک مرزا نسیم سے ملا تو دل میں کسقدر خوش آئندہ امیدیں لیکر آیا تھا، کس قدر جوش اور سرگرمی سے کام کرنیکا ارادہ تھا۔ کیسے کیسے منصوبے گانٹھے تھے مگر نتیجہ کیا ہوا، سروش کی ایڈیٹری پر طرزی کا تقرر ہوگیا، یہ مانا کہ رسالہ ایک سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا مگر اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس رسالہ کے تعلق نے طرزی کو ملک کے مشہور ادیبوں کی صف اوّل میں جگہ دی، غالباً یہی مدنی کے ساتھ ہوتا،

اس واقعہ کے پانچ برس بعد مدنی کا ناول "مجنون خواب" شائع ہوا، یہ تین سال کی شبانہ روز جانکاہی کا نتیجہ تھا۔ کسقدر امیدیں اس سے وابستہ تھیں مگر سب بے سود، اس کی اشاعت کے ایک ہی ہفتہ بعد طرزی کا مشہور ناول "طوفان" شائع ہوا، غل مچگیا، ہر شخص کے ہاتھ میں طوفان نظر آنے لگا۔ ریلوں میں۔ ہوٹلوں میں جہاں دیکھو طوفان موجود ہے، طرزی کا نام ہر زبان پر تھا، اور لطف یہ کہ طوفان میں سوائے چند ہوش ربا اور پُر درد

واقعات کے اور کچھ نہ تھا" ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ ایک ناول سے دوسرے ناول کی اشاعت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ مگر اتنا تو سوچئے کہ "اگر طوفان نہ شایع ہوتا یا کم سے کم اتنی جلد نہ شایع ہوتا تو پبلک کا وہ محدود، نادان، بے خبر، خود پرست اور خود رائے طبقہ جو صرف چرب زبانی سے ایک کتاب کی اشاعت پر زبردست اثر ڈالتا ہے یقیناً "مجنون خواب" کو ہاتھوں ہاتھ لیتا،" مگر یہ نہ ہوا طوفان شائع ہوا اور دو ہی چار ہفتہ میں اُس کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

اسکے بعد اور بہت سے واقعات ہوئے، اور ہمیشہ کسی نہ کسی صورت سے یہ دُبلا پتلا، کاغذی، لاغر انسان مدنی کی راحت اور اُس کی کامیابی میں رخنہ انداز ہوا ہے۔

مدنی کے دماغ پر ان تمام واقعات کا بہت گہرا اثر تھا۔ طرزی کا خیال اسکے لئے کسی ڈراونے بھوت سے کم نہ تھا۔ نور نگر کے ایک غیر آباد حصہ میں پڑے ہوئے رات دن اپنی ناکامیوں پر افسوس کرتا رہتا، نہ دوست نہ احباب نہ کوئی ہمدرد نہ قدر شناس۔ وہ ناکام رہا۔ لیکن اس میں خود اس کا قصور نہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس علمی تبحر اور ادبی مذاق کے ہوتے ہوئے اس کا قصور کیونکر ہو سکتا تھا۔ یہ تو زندگی کی جدید روشوں اور معیشت کے نئے طریقوں کا قصور ہے، تعلیم، تربیت اور تہذیب کا کھوٹ ہے، اس مجہول مصالحے کی خطا ہے جس کی آمیزش سے انسانی ادراک اور شعور اور فہم کا خمیر گوندھا گیا ہے —— اور ان سب سے زیادہ سنگین تقصیر طرزی کی ہے۔

مدنی چاہتا تھا کہ کبھی طرزی کی صورت نہ دیکھے، کبھی اس کے سامنے نہ آئے کبھی اس کا نام بھی نہ سُنے، مگر جس وقت اُسے ذیل کا تار موصول ہوا تو اُسکی حیرت کی انتہا نہ تھی،

کیا تم اتوار اور پیر کو نور نگر میں رہو گے؟ دو روز تمہارے پاس قیام کرنا چاہتا ہوں "طرزی جیلانی"

مدنی نے بار بار آنکھیں مل کر تار پڑھا۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ طرزی کا تار ہے اور پھر —— پھر ایک راز جویانہ جذبہ کے اثر میں ایک حقارت آمیز کشش کی وجہ سے ایک گہرے پوشیدہ مقصد کی تحریک سے جس کا تجزیہ کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی مدنی نے

تار کے جواب میں لکھ دیا۔

"آجاؤ میں نورنگر ہی میں رہونگا"

چنانچہ طرزی نورنگر آگیا اور یقین کیجئے کہ اس طویل مسافت کا سبب سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا کہ وہ اُس نامعلوم شکایت کو دور کرے جو مدنی کو پیدا ہوگئی تھی اور جس کا علم اُسے شیبانی کے ذریعہ ہوا تھا'

"مدنی! مجھے بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے میرے لئے یہ خیال تکلیف دہ ہے کہ تم مجھ سے کسی وجہ سے ناراض ہو' ممکن ہے کہ وجہ شکایت محض کوئی غلط فہمی ہو' ممکن ہے واقعی مجھ سے کوئی فروگذاشت ہوئی ہو"

طرزی نے یہ الفاظ خلوص نیت سے کہے تھے اس کا دل صاف تھا وہ چاہتا تھا کہ مدنی کا دل بھی اُس کی طرف سے صاف ہوجائے'

مدنی نے جواب دیا "کوئی بات نہیں ہے' شیبانی نے غلط کہا' شیبانی نے جھوٹ بولا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے"

طرزی نے خوش ہوکر کہا "مجھے بڑی مسرت ہوئی تعجب تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس سے تمہیں کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہے' میں تمہارا مخلص دوست ہوں' مجھے تم سے محبّت ہے"

جب طرزی کی گفتگو جاری تھی اُس وقت مدنی کی نفرت اور حقارت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ تیز اور مہلک زہر کو خوش ذائقہ شربت ظاہر کر کے خود ہی پی گیا'

(۲)

اگلے روز صبح کے وقت طرزی نے پھر مدنی سے کہا "مدنی ایک بار پھر کہدو کہ تمہارا دل میری طرف سے صاف ہے' مجھے اطمینان ضرور ہے مگر کبھی کبھی کچھ خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ شاید تم کچھ ناراض ہو"

مدنی نے نیچے سے اوپر تک طرزی کو دیکھا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ خیال آیا کہ یہ دونوں آگ کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں نکال کر پھینکدوں اور پیشانی کے نیچے دو گہرے گڑھے چھوڑ دوں، خون میں بھرے ہوئے اور روشنی سے محروم، کاش میں اسقدر بے بس نہ ہوتا،

"بھائی میں تم سے کل شام کہہ چکا ہوں، آخر شکایت کی کوئی وجہ بھی ہو"

طرزی نے کہا اس وقت میں بہت ہی خوش ہوں، مدنی مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ سے محبت ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہاری فطرت شناسی اور نکتہ رسی کی تعریف کی ہے، تمہارا وہ ناول ..... اُس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا، کچھ خواب کے متعلق ہے ——"

"مجنونِ خواب"

"ہاں "مجنونِ خواب" مجھے بہت پسند ہے، اس پر کچھ قدامت پرستی کا اثر سہی لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ تمہارے کمال انشا پردازی کا نمونہ ہے اس کی اشاعت یقیناً امید سے کم رہی،

"ہاں اشاعت کم رہی"

"زمانہ قدر شناسی میں ذرا سُست ہے، تمہاری قدر ضرور ہوگی، آج نہ سہی کل سہی۔ قابل قدر چیز کامیاب ہو کر رہتی ہے۔"

"ہاں میری قدر ہوگی،"

"میری بات تو ظاہر ہے کہ جتنی مقبولیت مجھے ہوئی ہے اُس کا میں ہرگز مستحق نہ تھا لیکن مجھے مقبولیت ضرور حاصل ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مجھے کسرِ نفسی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، ابھی دنیا نے تمہاری قدر نہیں پہچانی، تم میں ایک کامیاب انشاپرداز اور ادیب کی تمام خصوصیات موجود ہیں صرف اتنی بات ہے —— بھائی بُرا نہ ماننا، تم میرے دوست ہو، مجھے حق حاصل ہے کہ اپنے

نزدیک جو خامیاں تمہارے اندر دیکھوں تمہارے منہ پر اُن کا اظہار کردوں —— صرف اتنی بات ہے کہ تم اپنے زمانے سے کچھ پیچھے ہو تم زمانے کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے اور اس کی وجہ ظاہر ہے' تم تنہائی پسند ہو' دنیا سے الگ نور نگر کے ایک گوشہ میں پڑے ہو تمہیں کیا خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے''

مدنی نے اپنی داہنی طرف آسمان کی سمت دیکھا اُس کی پیشانی پر خفیف سی شکن پڑی اور پھر نظریں طرزی کی طرف رجوع ہوئیں۔

طرزی کی تقریر جاری رہی، ''میں تو چھ مہینہ بمبئی میں رہتا ہوں' وہاں دلچسپی اور تفریح کی ہر چیز موجود ہے' تین مہینہ کشمیر میں صرف کرتا ہوں اور تین مہینہ اور مختلف مقامات مثلاً بنارس۔ ہردوار وغیرہ کی سیر کرتا ہوں'

کشمیر! اُف کشمیر! اس نام میں کیسی کشش ہے!

مدنی کے دل پر چوٹ سی لگی' اُسے کشمیر جانیکا کسقدر شوق تھا' کاش کسی طرح دو ہی چار روز کے لئے اس فردوس ارضی کی زیارت نصیب ہوتی' مگر کبھی اتنا روپیہ نہ ہوا کہ وہاں جا سکے اور اس خود بین' خود پسند' مغرور جاہل کو دیکھو ——

مدنی کچھ بے چین ہو کر اُٹھا اور دریچہ کے باہر کی طرف جھانک کر بولا ''طرزی ٹہلنے کیلئے چلتے ہو' یہ تفریح کے لئے بہت اچھا وقت ہے'

(۳)

یہ فقرہ زبان سے نکلنے کے بعد مدنی کے چہرہ پر حیرت سی چھا گئی' خدا جانے اُس نے ٹہلنے کی تجویز کیونکر پیش کردی' آخر طرزی کو وہ کیوں ٹہلنے کے لئے لیجائے' نور نگر کی فضا اس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جیسے بہت سے دیو دوزانو بیٹھے ہوں' خوبصورت جھیلیں' سبزہ زار یہ سب چیزیں اس غریب کیلئے ایک چھوٹے سے کشمیر سے کسی طرح کم نہ تھیں' کسقدر ظلم اور ناانصافی ہے کہ اس میں بھی طرزی شریک ہو جائے مدنی کو خیال ہوا کہ کہیں اور کسی نے تو یہ ٹہلنے کی

تجویز پیش نہیں کی ہے" اس خیال کا اسقدر غلبہ ہوا کہ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا بھی کہ شاید واقعی کوئی تیسرا شخص کمرے میں موجود ہو"

آخر دونوں تفریح کے لئے چلے، سڑک پہاڑوں کے بیچ میں ہو کر گئی تھی جب بلندی پر چڑھنا ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک سیدھی آسمان تک جا رہی ہے۔ جب نشیب میں اُترنا ہوتا تھا تو یہ نظر آتا تھا کہ سبزہ زار کے اندر کسی جھیل میں غرق ہو گئی ہے،

طرزی نے مدنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا "مدنی! تمہارے ساتھ اس طرح تفریح کے لئے چلنا کیسا لطف انگیز ہے، مجھے آج کا دن عمر بھر یاد رہیگا' میرا ضمیر جذبات سے گوندھا گیا ہے' میں زود حس ہوں اور گداز دل رکھتا ہوں' بھائی دنیا چند روزہ ہے محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے سہارے وقت مسرت سے گذر سکتا ہے' تم بہت ہی تنہائی پسند ہو' یہ نہ ہونا چاہیئے۔"

طرزی کے لفظ مدنی کے سینہ میں تیر کی طرح اُتر گئے' اس چھوٹے سے کمزور ہاتھ کا مس کسقدر عجیب تھا' اتنی دور سے تم دل کی حرکت کی آواز سن سکتے تھے' بار بار بے اختیار جی چاہتا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اس دُبلے پتلے ہاتھ کو ایسی زور سے موڑا جائے کہ ہڈیوں کا چورا ہو جائے ——— اُف کھولتے ہوئے پانی کی طرح خون میں جوش آتا ہے۔ مگر کچھ بس نہیں چلتا'

مدنی ذرا ٹھٹکا' "یہ نور نگر کی حد ہے' وہ سرا ہے' یہاں کے قریب ہی پہاڑیوں کے بیچ میں ایک بڑی خوبصورت جھیل ہے' میں اکثر اس میں تیرتا ہوں۔ چلو تمہیں دکھاؤں تم بہت پسند کرو گے۔"

(۴)

نور نگر کے قرب و جوار میں بہت سی جھیلیں تھیں اور سب پہاڑوں کے درمیان میں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قد آور دیو ناف تک پانی میں خاموش کھڑے ہیں۔ چند بادل پہاڑوں

کی چوٹیوں کا تکیہ بنائے سو رہے تھے۔ ہر طرف سکوت تھا' آسودگی تھی' سکون تھا' کیسا پیارا سماں تھا' کسقدر دلکش نظارہ تھا۔ طرزی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمین سے اُدھر چل رہا ہے۔ کوئی اُسے اُٹھا کر لیئے جا رہا ہے'

مدنی نے کہا "یہ جھیلیں بہت گہری ہیں' عمیق ہیں' اتھاہ ہیں' آجتک کوئی ان کی تہ تک نہیں پہنچ سکا ہے'

طرزی نے کہا "مجھے کبھی تیرنا نہ آیا' ہمیشہ پانی سے ڈرا' یہ خیال دماغ میں جم جاتا ہے' کہ ڈوب جاؤں گا"

مدنی خیال میں غرق ہوگیا' طرزی اس سے دو قدم پیچھے تھا۔ ان کے داہنی طرف ایک چٹان پر پہاڑ کی تلیٹی میں پتھر کی چند کانیں تھیں' سونی' ویران' افتادہ اور اُجاڑ یہاں ذرا چڑھاؤ زیادہ تھا' طرزی کی سانس پھول گئی' کانوں کے نیچے ہوتے ہوئے دونوں پانی کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ پانی کبھی سنہرا' کبھی میلا' کبھی بھورا' کبھی سفید مختلف رنگوں میں پیش نظر تھا۔ آخر مدنی ایک پہاڑ کی گود میں تاریک پانی کے کنارے ٹھہر گیا "یہ جھیل مجھے بہت پسند ہے سب سے علیحدہ ہے اور چاروں طرف سے سرسبز و شاداب پہاڑ ہیں' شفق کی ہلکی ہلکی روشنی میں پہاڑ کیسے عجیب معلوم ہوتے ہیں' گویا اُن کے چوڑے چکلے سینوں پر زندگی مچل رہی ہے" طرزی اس وقت ہم یہاں تنہا ہیں' کسقدر سناٹا چھا رہا ہے' اب تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو جائیگا اور بس پھر تاریکی ہے' طرزی کیسی پیاری جھیل ہے' تمہیں معلوم ہے یہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بلا شرکت غیرے اس کا مالک ہوں' جیسے تم اپنی تمام تصانیف کے' اپنی تمام عزت اور شہرت اور کامیابی کے مالک ہو وہ میری ملکیت ہے اور یہ سب چیزیں تمہاری ملکیت ہیں'

طرزی: "اُف! پانی کسقدر تاریک' ہولناک اور ڈراؤنا ہے'"

مدنی! "یہ جھیل یہاں کی سب جھیلوں سے زیادہ گہری ہے' کوئی اس کی خبر نہ لا سکا

مجھے اس سے بہت اُنس ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ ایک دن مجھ پر اپنا راز سربستہ کھول دے گی،"

طرزی کو اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی، اُسنے کہا "تمہاری جھیل بہت خوبصورت اور دلفریب ہے اب چلو، راستہ سخت اور پیچیدہ ہے، ہوا میں خنکی اور ٹھر پیدا ہوگئی ہے،" مدنی طرزی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو چلا "دیکھو پانی میں نکلی ہوئی اس چٹان کے سر پر سے جھیل کیسی بھیانک معلوم ہوتی ہے، یہ نظر آتا ہے کہ پہاڑ برابر قریب تر آتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک دوسرے سے پیوست ہوجائیں گے اور ہم بیچ میں کچل کر رہ جائیں گے،"

اب دونوں چٹان کے سرے پر پہنچ گئے، اس میں شک نہیں کہ پانی یہاں سے بہت تاریک اور عمیق معلوم ہوتا تھا، جیسے ہی طرزی نے جھک کر پانی میں جھانکا، مدنی کا ہاتھ اُسکی پتلی اور نازک گردن پر تھا، ایک ہلکا سا جھٹکا بہت کافی ہُوا، تیز اور باریک چیخ کی آواز آئی۔ پانی کی موجوں میں جنبش اضطراب نمودار ہوئی، ایک بے چین دائرہ پیدا ہُوا، پھر وہ بڑھا، وسیع ہوا، اور زیادہ وسیع ہُوا اور پھر خاموشی تاریکی ہوگئی،

(۵)

خاموشی بڑھتی رہی، جھیل پر قابو حاصل کرلینے کے بعد وہ اور بڑھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے حس وحرکت، سنسان پہاڑوں کے پاس انگشت برلب پہنچی اور پھر اُنھیں بھی پار کرگئی، مدنی وہیں کھڑا رہا، اسکی نظر جھیل کے تاریک پانی پر جمی ہوئی تھی، وہ خیالات کی گہرائیوں میں غرق تھا۔ اُسے ایک قسم کی تسلّی تھی، تسکین تھی، اطمینان تھا، وہ گو مسرور نہ تھا، خوش نہ تھا مگر مغموم اور ملول بھی نہ تھا،

آخر طرزی رخصت ہُوا، وہ یاوہ گو، ہرزہ سرا، خود بیں، خود پسند، مغرور وجود رخصت ہُوا، مدنی نے دیکھا کہ جھیل مُسکراتے ہوئے اُسکے چہرہ کو تک رہی اور کہتی ہے "تم نے

جو کچھ کیا بہت خوب کیا، میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہوں، اس کارنمایاں کے انجام دینے والے دو ہیں، میں اور تم، مجھے تم پر فخر ہے،،

اس وقت مدنی کا دماغ مصروف تھا، تیزی سے کام کر رہا تھا، ناکامی کی آگ میں جل رہا تھا، آخر عمل کا وقت آگیا، جو کچھ کرنا تھا کر گذرا، مدنی نے چاروں طرف نظر اٹھا کر سنجیدہ اور سلیم پہاڑوں کو دیکھا، وہ مفتخر تھا ——— اور وہ سرد تھا لرزاں تھا، ہاتھ پیر قابو میں نہ تھے، اندھیرا گہرا ہوتا جاتا تھا، بہت دیر ہوگئی ہے اب یہاں سے چلنا چاہیئے۔

مدنی گھر کی طرف چلا، سردی سے اسکے دانت بج رہے تھے، سارا جسم کانپ رہا تھا وہ گھر کی طرف جا رہا تھا اور جانا نہ چاہتا تھا، اس وقت جھیل کی جدائی اسے گوارا نہ تھی، جھیل اسکی دوست تھی، دنیا میں سوائے اس جھیل کے کوئی اس کا ساتھی نہ تھا، کوئی سازداں نہ تھا، کوئی ہمدرد نہ تھا، جھیل سے پھوٹ کر وہ بالکل تنہا رہ جائیگا۔ بے یار و مددگار رہ جائیگا ——— اب وہ گھر کی طرف جا رہا تھا، مگر گھر تو اب بالکل خالی ہے، ایک مہمان قیام پذیر تھا، اب وہ وہاں نہیں ہے، اب وہ کبھی نہ آئیگا،

مدنی یکایک دوڑا یہ نہیں معلوم کیوں، اسے سوائے اسکے اور کوئی خیال نہ تھا کہ جھیل سے جدا ہونے کے بعد اب وہ تنہا رہ گیا، دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑوں سے آواز پیدا ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اور اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے، مدنی ٹھہر گیا اور پیچھے دوڑنے والا بھی ٹھہر گیا، اس نے شام کے سناٹے میں گہری سانسیں لیں، اس وقت اسے گرمی معلوم ہو رہی تھی، سر سے پیر تک پسینہ میں شرابور تھا، پیشانی سے رخساروں سے پسینے کے قطرے برابر ٹپک رہے تھے، ٹانگیں کانپ رہی تھیں، دل دھڑک رہا تھا، تھوڑی دیر ٹھہر جانے سے کچھ سکون ہوا، پھر دوڑا، اور زیادہ زور سے دوڑا، بستی کے مدھم مدھم چراغ نظر آئے، کچھ یقین ہوا کہ سب کچھ اسی طرح ہے کوئی چیز بدلی نہیں ہے، مگر ابھی

یہ خیال دل سے نہیں نکلا کہ کوئی پیچھے پیچھے آرہا ہے، کئی مرتبہ پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا،

مدنی کا دماغ اس وقت اسقدر تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا، آخر یہ پیچھے کون آرہا ہے، جھیل ہے، ہاں جھیل اس کے ساتھ ساتھ ہے، پھسلتی ہوئی لغزش کرتی ہوئی، رینگتی ہوئی آرہی ہے، مدنی نے جھیل کی آواز سنی، "جو کچھ کیا ہے ہم دونوں نے ساتھ کیا ہے، میں یہ نہیں چاہتی کہ تم تنہا ذمہ واری کا بار سنبھالو، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہیں تنہا نہ چھوڑونگی"

آخر مدنی گھر پہنچ گیا، اپنے کمرے میں ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا، کمرے کے اندر ساری چیزیں اُسی طرح موجود تھیں، کتابیں بھی وہی تھیں جن پر طرزی للچائی ہوئی نظریں ڈال رہا تھا، میز بھی وہی کرسیاں بھی وہی، آرام کرسی پر لیٹتے ہی مدنی کو نیند آگئی، بڑی دیر تک بے خبر سوتا رہا، جب کافی وقت گذر گیا تو ملازم نے آکر جگایا اور کہا کھانا تیار ہے، کمرے میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں جو بہتیرا اُچک اُچک کر کمرے کو روشن کرنا چاہتی تھیں، مگر پھر بھی تاریکی کم نہ ہوتی تھی، وہ طرزی کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اب وہ نہ آئیگا بار بار دروازے کی طرف دیکھتا تھا مگر اُدھر اندھیرا اسقدر گہرا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا، کھانا چنا ہوا رکھا تھا اور رکھا رہا، اس نے ایک لقمہ بھی نہ توڑا، اُٹھکر کمرے کی کھڑکی کھولی، باہر کو جھانکا، معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے کان کسی آواز کے منتظر ہیں، بے چین پانی کی آواز اس سناٹے میں کچھ ل چل، کچھ اضطراب، جیسے کوئی تالاب، کوئی جھیل جوش میں اپنی حدوں سے نکل جاتی ہے، درختوں کے پتوں کی جھڑ جھڑاہٹ ——— اکدم گھبرا کر اُس نے کھڑکی بند کرلی، کمرے میں چاروں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔

(۶)

مدنی سونے کے لئے بستر پر لیٹا، نیند کا پتہ نہ تھا، دماغ تیزی کے ساتھ مصروف تھا، دل دھڑک رہا تھا، اُسے بار بار خیال ہوتا تھا کہ مجھے کوئی آواز دے رہا ہے، وہ ہمیشہ کھڑکیاں کھول کر سویا کرتا تھا، آج چاندنی ایک مریض کی طرح ایک روگی کی طرح ناتوان اور زرد رو اُس کے کمرے میں داخل ہوئی، مدنی نے کھڑکی کی طرف دیکھا، اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چیز حرکت کر رہی ہے، میلی میلی زرد چاندنی میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی، مدنی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، بالکل بہتا ہوا پانی معلوم ہوتا تھا، مدنی کے ہوش اُڑ گئے، اُس کے کانوں میں کھڑکی کے باہر پانی کے اکٹھا ہونے کی آواز آنے لگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی برابر چڑھتا آرہا ہے، تیزی سے نہیں، بے چینی کے ساتھ نہیں بلکہ آہستہ آہستہ مگر بڑی کثرت سے،

مدنی بستر پر بیٹھ گیا اور جھک کر دیکھا، کھڑکی کے نیچے پلنگ کے قریب پانی ہی پانی نظر آیا، اُس نے چوکھٹ کی طرف بہتے ہوئے دیکھا، پھر اُسے رُکتے ہوئے اور پھر پلنگ کی طرف کو آتے ہوئے دیکھا، عجب یہ ہے کہ کھڑکی کے باہر پانی کے چڑھنے کا شور تھا، مگر کمرے کے اندر خاموشی طاری تھی، ہلکی چاندنی میں پانی برابر چڑھ رہا تھا، مدنی نے بستر سمیٹ لیا اور سرہانے کی طرف دوزانو بیٹھ گیا، نیچے کو دیکھا ایک چیخ ماری، کمرے کی زمین چمکدار پانی کے قبضہ میں تھی، پلنگ کے آدھے پائے غرق تھے، پانی چڑھ رہا تھا، بلا روک ٹوک بلا وقفہ کے چڑھ رہا تھا، اس کے روکنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی، کاش وہ کسی طرح دروازہ تک پہنچ سکتا، پاؤں پلنگ کے نیچے لٹکائے، پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا، جیسے ہی وہ جھکا ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُسے پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے، مدنی اوندھے منہ زمین پر آیا، اس کا سر اس کا منہ ٹھنڈے پانی میں تھا، اس نے ہاتھ پاؤں مارے، اب پانی سینے تک

آ گیا، چیخ ماری، پھر چیخ ماری، سامنے شیشہ تھا، کتابیں تھیں، تصویریں تھیں، مگر کسی پر اثر نہ ہوا، دروازے کی طرف جانے کی کوشش کی مگر سب بیکار، اب پانی اسکی گردن کے قریب تھا، کسی نے یکایک اسکے پیر کا انگوٹھا پکڑ کر کھینچنا شروع کیا، بہتیرا چھوٹنے کی کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی، "مجھے چھوڑ، ظالم چھوڑ، مجھے تجھ سے نفرت ہے، میں تیرے پاس جھیل کی بھیانک تاریکی میں آنا نہیں چاہتا"—— یہ کہتے اسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک سرد ہاتھ نے اس کا منہ بند کر لیا، دم گھٹنے لگا، پانی آنکھوں پر چھا گیا اور پھر اندھیرا ہی اندھیرا تھا،

صبح کو ملازم ناشتے کے لئے پوچھنے آیا، آواز دی، "سرکار! سرکار!" کچھ جواب نہ ملا، ڈر گیا، خوف سے کانپنے لگا، یہ کیا ہو گیا، اس کے آقا کی آنکھیں ابلی پڑی تھیں، مٹھیاں بند تھیں، باہر جا کر محلہ والوں کو بلایا، سب نے مل کر لاش کو اٹھایا کوئی غیر معمولی بات معلوم نہ ہوئی ایک صراحی بیشک اوندھی پڑی تھی اور اس کا پانی کمرے کے فرش پر پھیل گیا تھا اور بس،

(پیمانہ)

تخیّل محبّت

(از مولوی سیّد ابو محمّد صاحب ثاقب کانپوری - ایڈیٹر رسالہ نظارہ)

(۱)

شاہی خزانے میں چوری ہو چکی ہے، بادشاہ کوتوال کو حکم دے رہا ہے کہ اگر چور جلد از جلد گرفتار نہ کیا گیا تو تیرا چراغ زندگی ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جائیگا۔ اس عتاب آمیز شاہی حکم کو سُنکر پہرہ داروں نے گھر گھر چور کی تلاش شروع کی۔

شہر سے دُور ایک شکستہ مندر کے کھنڈر میں ایک غریب الوطن تاجر بچہ اسین بیخبر سو رہا تھا۔ وہ گھوڑوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اور اسی غرض سے کاشی آیا ہوا تھا۔ مگر تمام مال چوری جانے کی وجہ سے ناکام۔ وطن واپس جانے والا تھا۔ کہ شاہی پہرہ داروں نے چور سمجھ کر گرفتار کر لیا اور ہتھکڑی ڈالکر اُسے قیدخانے کی طرف لے چلے۔

اسوقت خوبصورت شیامہ اپنی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی سڑک سے گزرنے والوں کی آمد و رفت کا تماشہ دیکھ دیکھ کر اپنا وقت گزار رہی تھی۔ اسے یہ مجمع خوابیدہ مسافروں کی ایک لہر معلوم ہوتا تھا یکایک وہ اپنی اس خیالی سیر سے چونک کر کہنے لگی۔

”خدا جانے یہ خوبصورت شخص جس نے مہندر کے حسن کو بھی شکست دیدی ہے۔ سپاہی کیوں اسے اس طرح ہتھکڑی ڈالے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔

یہ سوچکر اس نے اپنی خادمہ سے کہا۔ ”جا اور میری طرف سے کوتوال سے کہہ کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس ہوتے جائیں۔“

کوتوال جو اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا۔ لڑکی کی زبانی شیامہ کا یہ پیغام سُن کر چونک پڑا۔ اسکے سارے جسم میں جذبات کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور فوراً قیدی کو اپنے ساتھ لئے ہوئے شیامہ کے مکان کی طرف چلدیا۔ غریب بجراسین کا چہرہ شرم وندامت سے جھکا ہوا تھا۔

کوتوال نے مکان پر پہنچکر یوں کلام کی ابتدا کی "معلوم نہیں آپ نے اس بیوقت مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ مَیں سرکاری کام میں مصروف ہوں اجازت دیجئے کہ رخصت ہوں "

بجراسین جو ابتک شرم سے گردن جھکائے ہوئے خاموش کھڑا تھا۔ یکایک سر اُٹھا کر کہنے لگا "اے حسین عورت کیا کسی غریب الوطن اور بیگناہ مسافر کو اپنے گھر بلانے کے بعد اسکے زخموں پر نمک چھڑکنا جائز ہے اگر نہیں تو پھر یہ کس قسم کا مذاق ہے "

شیامہ نے آبدیدہ ہو کر کہا "آہ اے میرے بیگناہ پردیسی یہ تمہارے ساتھ کسی قسم کا مذاق نہ تھا۔ کاش مَیں اپنے زیورات اور تمام روپیہ دیکر تمہارے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑی خود پہن سکتی، یقین کرو کہ تمہاری اس ذلت کے احساس سے میرا دل پاش پاش ہوا جاتا ہے"

شیامہ نے یہ جملہ کچھ اس طرح ادا کیا۔ گویا وہ اپنے الفاظ اور آنسوؤں سے اسکی ذلت کے داغوں کو دھونا چاہتی ہے۔

شیامہ نے کوتوال کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا۔ کہ "جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لیلو اور اس غریب قیدی کو چھوڑ دو" مگر کوتوال نے کہا کہ مجھے اپنی اس مجبوری پر افسوس ہے کہ مَیں آپکے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا، شاہی خزانے کی چوری نے بادشاہ کی آتشِ غضب کو مشتعل کر دیا ہے۔ جو بغیر کسی انسانی خون کے نہیں بجھ سکتی "

یہ سُنکر شیامہ سناٹے میں آگئی اور عاجزی سے کوتوال کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی "خیر اگر آپ اسکی جان نہیں بچا سکتے تو کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف دو دن تک آپ اسے قید میں رکھ سکیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس آخری التجا کو رد نہ کرینگے "

کوتوال نے سر جھکا کر کہا۔ کہ مَیں آپکے اس حکم کی تعمیل کرونگا۔

(۲)

ایک رات گزر جانے کے بعد دوسری رات کو جب شیامہ اپنے ہاتھوں میں چراغ لئے ہوئے قیدخانے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ بجراسین اپنی بیگناہی کا اظہار کر کے خدا سے تخفیف سزا کی دعائیں مانگ رہا ہے۔

شیامہ نے یہ دیکھ کر محافظ کو اشارہ کیا جس نے فوراً بجراسین کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔

قیدی نے حیرت سے شیامہ کے خوبصورت کنول جیسے چہرے کو دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آہ اس بدقسمتی کے تاریک لمحوں میں یہ کون ہے جو فرشتۂ رحمت بنکر نازل ہوا ہے۔ اے رحمدل اور میری محسن حسینہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آپکے اس احسان کا شکریہ ادا کرسکوں۔"

"میں اور "فرشتۂ رحمت" میں اور "رحمدل" یہ الفاظ تھے جنہیں بار بار دھرا کر وہ ہنسی اور کوٹھری قہقہوں سے لبریز ہو کر اور بھی زیادہ مہیب معلوم ہونے لگی۔ دیوانگی اور خوف سے لبریز قہقہے اسی طرح بلند ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں کے عمیق سمندر میں غرق ہو گئے۔

اس نے اپنی آواز کو تیز کر کے کہا "ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس عظیم الشان عمارت میں ایک پتھر بھی ایسا نہیں جو شیامہ کے دل سے زیادہ سخت ہو" لیکن وہ بجراسین کو اپنے ساتھ لئے ہوئے باہر نکل آئی۔

جنگل کے مشرقی حصے میں برنا ندی کے کنارے جہاں اشنان گھاٹ پر ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی طلوع سحر میں تبدیل ہو رہی تھی۔

خوبصورت عورت نے کشتی میں کھڑے ہو کر کہا۔ میرے پردیسی اور عزیز مسافر آ اور دیکھ کہ شیامہ تیرے اور صرف تیرے لئے دنیا کے تمام مضبوط سے مضبوط رشتوں کو توڑ کر اپنی قسمت کا لنگر ایک دیا اور ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر اٹھا رہی ہے۔ اسکے بعد دونوں نے ملکر کشتی کو گھاٹ سے کھولدیا۔

ندی کے دونوں طرف خوبصورت پرندے نغمہ سنجی میں مصروف تھے۔ مرد نے عورت کا سر اٹھایا اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگا "میری محسنہ مجھے بتاؤ۔ کہ میری رہائی کیلئے تم نے کس قدر رقم صرف کی ہے تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ یہ بے سروسامان انسان تمہارا کسقدر ممنون ہے"

شیامہ نے اسے گلے لگا کر کہا۔ میرے پیارے ابھی اس کے بتانے کا وقت نہیں آیا۔

پانی کی روانی اور ہوا کی تیزی سے کشتی سرعت کیساتھ ندی میں جا رہی تھی۔ آفتاب اپنی منزل طے کر چکا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں نہا کر اپنے گیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی پانی کے گگرے لیکر اپنے اپنے مکانوں کو واپس جا رہی تھیں۔ صبح کا شور و غل عرصہ ہؤا ختم ہو چکا تھا۔ دریا کے دونوں طرف کامل سکوت تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں بھی کوئی راہگیر دکھائی نہ دیتا تھا۔

پیپل کے نیچے پتھر کا بنا ہؤا ایک مضبوط گھاٹ تھا۔ جہاں دونوں نے نہا کر کچھ کھانے کے لئے کشتی کو ایک سہارے سے باندھ دیا۔ بڑے اونچے اور وسیع درختوں کا سایہ متحیر و ساکت تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس خاموش طلسم کو فاختہ کی "کوکو" توڑ دیتی تھی۔ دوپہر کی ہوا پختہ اناج کی خوشبو سے لبریز تھی۔ کہ دفعتاً شیامہ کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب اُلٹ گئی۔ اور بجراسین کے دل میں محبت کا دریا جوش مارنے لگا۔ اُس نے بھاری لیکن رُکتی ہوئی آواز میں جھجک کر کہا۔

"حقیقت میں تم نے مجھے قید کی زنجیروں سے نجات دلا کر اپنے احسان کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ کہ تم نے مجھے اس قید کی رہائی سے کیونکر نجات دلائی ہے۔"

عورت نے شرم سے اپنا منہ آنچل میں چھپا کر کہا۔ "اے میری آرزوؤں کے مرکز ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اس کے متعلق میں تمہیں کچھ بتاؤں۔

جب آفتاب کی سنہری کشتی اپنا لنگر اُٹھا کر مغرب کے دور و دراز ساحل پر چلی گئی تو شیامہ کی کشتی کو بھی نسیم کے جھونکوں نے ایک خوشگوار کنارے پر لگا دیا۔

(۳)

چاند مغرب کی تاریکی سے طلوع ہو رہا تھا۔ اُسکی دھندلی روشنی خاموش پانی کیساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ گھنے درختوں میں چھائی ہوئی تاریکی جھینگروں کے بے پناہ شور سے بربط کے تاروں کی طرح

تھی۔ چراغ بجھ گیا تھا۔ جنوبی ہوا تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اور شیامہ نوجوان کے ہاتھوں پر سر رکھے ہوئے گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اسکے حسین و معطر بال نوجوان کے زانو پر بکھرے ہوئے تھے۔ شیامہ نے ایک کمزور آواز میں کہا "میں نے جو کچھ تمہاری جان بچانے کیلئے کیا ہے اگرچہ وہ بہت مشکل کام تھا لیکن اسکا تمہارے سامنے بیان کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ مگر نہیں اب وقت آگیا ہے کہ میں نہایت اختصار کیساتھ تمہیں اس واقعہ کی تفصیل بتادوں لیکن میری محبت کا واسطہ کہ جب تم سن چکو تو اسے ہمیشہ کیلئے اپنے دل سے بھلا دینا۔

اُتیا جو میرے حسن کا پرستار اور میری محبت میں دیوانہ تھا اسی نے آہ اسی نے میرے کہنے پر تمہاری چوری کا الزام اپنے سر لے لیا۔ اگرچہ یہ میری زندگی کا بدترین اور ناقابل معافی گناہ ہے۔ مگر میں خوش ہوں کہ یہ سب کچھ تمہاری حفاظت کیلئے کیا گیا ہے۔

چاند ڈوب چکا تھا جنگل کے درخت ہزاروں پرندوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ آخرکار بجر اسین کے وہ ہاتھ جو شیامہ کی کمر سے لپٹے ہوئے تھے ڈھیلے ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ ان دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل حائل ہوگئی۔

بجر اسین خاموش ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً ایک مجروح جھینگے کی طرح شیامہ نے اپنا سر اسکے پاؤں پر رکھدیا۔ اور گہری سیاہی تمام سطح آب پر پھیل گئی۔

بدبخت شیامہ جسکے آنسو تک خشک ہو چکے تھے۔ نوجوان بجر اسین کے پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر کہنے لگی "میرے پیارے میں نے جو کچھ تمہارے بچانے کے لئے کیا ہے۔ خدا کیلئے اسے معاف کرو میں خدا کے ہاتھوں سے اس گناہ کی سخت سے سخت سزا برداشت کرنے کیلئے تیار ہوں۔ مگر تمہارے ہاتھوں سے کسی قسم کی سختی برداشت نہیں کرسکتی۔"

بجر اسین نے اپنا پاؤں سختی کیساتھ جھٹک کر چھڑا لیا اور غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "اے سیاہ کار عورت تجھے میری زندگی سے کیا واسطہ! آہ تو نے میری زندگی کو اپنے ناپاک مقصد کیلئے خرید کر تاریک کر دیا ہے۔

رات کی تاریکی میں کشتی کسی غیر معلوم سمت کو چلی جا رہی تھی۔ خشک پتے پاؤں کے نیچے دب کر کھڑکھڑا رہے تھے ہوا بند ہو گئی تھی۔ اور اونچے اونچے درختوں کے تنوں سے گویا ہزاروں وحشت ناک شکلیں تمام جنگل میں پھیلی ہوئی تھیں۔

تھکا ہوا مسافر زمین پر بیٹھ گیا۔ باوجود تاریکی اور نزاکت کے شیامہ بھی سائے کی طرح اسکے ساتھ تھی جب بجراسین نے اتنی مسافت طے کرنے کے بعد بھی اسے اپنے ساتھ ہی دیکھا تو نہایت خشمگین آواز میں چلا کر کہنے لگا۔

"اے ناپاک عورت تو اب بھی میرے ساتھ ہے!" مگر شیامہ بغیر جواب دیئے ہوئے بجلی کی تیزی کی طرح اسکے پاؤں پر گر پڑی۔

اسکی آواز جس میں عاجزی و انکسار تھا۔ کانپ رہی تھی۔ وہ مجنونانہ بیخودی میں برابر کہہ رہی تھی "ہاں تم مجھے مار ڈالو اور میری سیہ کاریوں کی سزا یہیں دیدو مگر مجھے اپنے قدموں سے علیٰحدہ کرنیکی کوشش نہ کرو۔"

جنگل کی چھائی ہوئی تاریکی جو ستاروں کی روشنی سے محروم تھی۔ یکایک کسی نامعلوم غصے سے لرزنے لگی اور درختوں کی جڑیں خوف سے زمین میں ہل گئیں۔ کچھ دیر تک عورت کی منت اور عاجزانہ درخواست کی آوازیں آتی رہیں۔ مگر فوراً ہی ایک چیخ کیساتھ کسی کے پتوں میں گرنے کی آواز آئی۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

(۴)

جس وقت بجراسین جنگل سے گزر رہا تھا۔ اس وقت طلوع سحر کی مدھم روشنی گنگا کے دوسری طرف سندر کے عکس پر پڑ رہی تھی۔ اس نے آج کا تمام دن گنگا کے اس ریتلے کنارے پر گزارا جہاں سورج اپنی پوری تیزی کے ساتھ اس کے جسم پر چمک رہا تھا۔

گاؤں کی ایک دوشیزہ لڑکی جو پانی بھر کر واپس جا رہی تھی اسکی اس حالت کو دیکھکر کہنے لگی "شاید تم کوئی مسافر ہو۔ اگر تمہارے رہنے کی یہاں کوئی جگہ نہ ہو تو میرا گھر تمہارے لئے شوق سے حاضر ہے جہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی لیکن بجراسین نے اس کا کوئی جواب نہ دیا" پیاس کی شدت سے قریب تھا کہ اس کا دم نکل جائے۔ مگر اس نے اس بہتے ہوئے

دریا کا ایک قطرہ بھی نہ پیا۔

جب دن ختم ہو گیا۔ تو اس کو اپنے جسم میں بخار کی سی تپش محسوس ہونے لگی۔ اور وہ مجروح طائر کی طرح کشتی میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کشتی میں بستر پر صرف ایک ہی پازیب پڑی ہوئی ہے جسے اُٹھا کر اس نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اگرچہ اس کی آواز تیر کی طرح اسکے سینے سے پار ہوئی جاتی تھی ۔

(۵)

پانچویں رات کا چاند سپتا پرنا کے درختوں سے طلوع ہو رہا تھا۔ اور بجر اسین اپنے ہاتھوں کو جنگل کی طرف اُٹھائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آہ یہ کس حسن محبوب کا جلوہ ہے۔ جو اس جنگل کی خوفناک تاریکی میں دریا کے کنارے دکھائی دے رہا ہے آ آ۔ اے میری محبت آ"

ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ شیامہ دوڑتی ہوئی آئی اور اسکے قدموں پر سر رکھ کر کہنے لگی۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ اب میں اس محبت کی کافی سزا پا چکی ہوں۔

بجر اسین نے مشتاق نظروں سے شیامہ کی طرف دیکھا اور وفورِ شوق سے مجبور ہو کر اسے اپنی آغوشِ محبت میں لینے کیلئے ہاتھ پھیلا دِئے مگر فوراً جھجک کر کہنے لگا۔

"آہ اے گزشتہ گناہوں کی یاد تو پھر یہاں رہ گئی"

اور یہ کہہ کر اس نے اسکی پازیب اپنی بغل سے نکال کر ایک بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح دور پھینک دی۔ اور اپنی آنکھیں بند کر کے شیامہ کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔

عورت خاموش ہو گئی۔ اور دو زانو ہو کر مرد کے پاؤں پر سر رکھ کر تیز بہنے والے دریا کے کنارے آہستہ آہستہ اس طرح غائب ہو گئی جس طرح یکایک آنکھ کھُل جانے کے بعد رات کی تاریکی میں خواب جذب ہو جاتا ہے ۔

(ٹیگور)

بدگمانی

(از شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی)

محمد صادق انگلستان میں چار سال تک انجینیری کی تعلیم حاصل کرکے ہندوستان واپس آنیکی تیاری کر رہا تھا کہ اُسکے ایک ہم جماعت رابرٹ پیرن نے اُسے چند دنوں کیلئے اپنے گاؤں چلنے کو کہا تاکہ وہ انگلستان کی دیہاتی زندگی کے مشاہدات سے بھی بہرہ اندوز ہو سکے۔

رابرٹ پیرن کا باپ کلارک پیرن تقریباً پچیس سال تک مدراس، بنگلور اور میسور کے گرد و نواح میں عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرتا رہا اور اب بوجہ کہنہ سالی اس دینی خدمت سے سبکدوش ہو کر سپائی ٹن نامی ایک چھوٹے سے غیر معروف گاؤں کے گرجے میں معمولی پادری کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ سپائی ٹن ایک پہاڑی قصبہ تھا جس کی آبادی دو سو نفوس سے زاید نہ ہوگی اور حیرت تھی کہ ایسی ویران جگہ آبادی اور ریل سے کوسوں دور کیوں انسانی آبادی کیلئے انتخاب کی گئی تھی لیکن جب اُس وادی کے خوبصورت سبزہ زاروں، سرسبز لہلہاتے کھیتوں، شگوفہ ریز درختوں اور خودرو معطر پھولوں پر نظر پڑتی تھی تو یہی غیر آباد، مہذب دنیا سے الگ خطہ رشک گلزار ارم معلوم ہوتا تھا۔ دن کے ڈوب بجے ہونگے، سورج کی ہلکی زریں کرنیں درختوں کی گنجان ٹہنیوں سے چھن چھن کر پادری کلارک کے مکان پر پڑ رہی تھیں۔ ہر چہار طرف امن برس رہا تھا۔ ایک سکوت، ایک خاموشی تھی کہ در و دیوار پر چھا رہی تھی لیکن بجائے اُداسی کے طبیعت میں جوش اور دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ خوبصورت بنگلہ کے برآمدے میں معمر پادری ایک آرام کرسی پر تمام دنیا کے گناہوں کے عوض سولی چڑھ جانے والے کی یاد میں، آنکھیں بند کئے لیٹا تھا،

کمرہ کے اندر اُسکی خوبصورت نوجوان لڑکی فلورا موسم بہار کی رنگین تیتری کی طرح اُچھلتی کودتی گلدانوں میں پھول سجا رہی تھی۔ آج دوپہر بعد اُسکا بھائی ایک ہندوستانی دوست سمیت گھر آنے والا تھا۔ وہ کس قدر مسرور تھی۔ یہ قابلِ فخر میزبانی سپائی ٹن کے کسی آدمی کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس مسرت میں ایک خوف ایک بے چینی ایک دلچسپی بھری تھی وہ یہ نہ سمجھ سکتی تھی۔ کہ آج ہمارے گھر میں کیا ہونیوالا ہے لیکن ایک معزز مہمان کی آمد کا خیال اُسکے دل میں ایک ہیجان۔ ایک ناقابل بیان خوشی کے انبار لگا رہا تھا۔ فلورا اُنیس برس کی کشیدہ قامت سفید گلابی رنگت کی نازک اندام لڑکی تھی۔ اُسکی آنکھیں بھوری اور بڑی بڑی۔ پیشانی بلند۔ صاف و شفاف۔ ناک لمبی نازک اور نہایت دلفریب۔ اُسکے لب پتلے اور گلابی رنگ کے تھے۔ اُسکی زنخدان بیضاوی اور مضبوط تھی۔ اُسکے سنہرے بال جن پر ریشمی اُون کا دھوکا ہوتا تھا نہایت اہتمام سے سر پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ صبح دس بجے سے کمروں کی صفائی۔ میز کرسیوں اور برتنوں کی ترتیب درستگی میں مشغول تھی اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی اور ہر لمحہ اُسکے بھائی اور غیر ملکی مہمان کے پہنچنے کی توقع تھی۔ ہر بار اُسکے دل میں آتا کہ ہمارا مہمان کس وضع و شکل کا آدمی ہوگا۔ شاید نہایت سیاہ و بدشکل، لیکن دوسرے لمحہ میں اُسکی یادداشت اس بات کی خود ہی تردید کر دیتی تھی کہ نہیں رابرٹ نے کئی دفعہ ذکر کیا کہ وہ سیاہ رنگت کا نہیں وہ ایک بہت بڑے امیر کبیر ہندوستانی تاجر کا لڑکا ہے۔ نہایت مہذب۔ خوش خلق اور بامذاق۔ اس تسلسل خیال سے اُسکا خون حدت پا کر اس کے گلابی رخساروں کو سُرخ بنا رہا تھا۔

بالآخر چار گھنٹے کی مسلسل مصروفیت کے بعد وہ تھک کر ایک کرسی میں گر گئی اور گہرا سانس لیکر اپنے سجائے ہوئے پھولوں کی طرف اطمینان کی نظروں سے دیکھا پھر یکایک اس خیال سے کہ آنیوالے مسافروں کو غسل کیلئے گرم پانی درکار ہوگا وہ کمرہ سے باہر نکل کر بوڑھے ملازم سے کہنے لگی " دیکھو ہم مہمانوں کے غسل کے لئے گرم پانی فوراً تیار ہونا چاہیئے

وہ آنے ہی والے ہیں۔ جلدی" یہ کہہ کر برق وش تیزی کے ساتھ اپنے غسل خانہ میں گھس گئی اور نیلے رنگ کا ایک خوبصورت ریشمی لباس پہن کر باہر نکلی تو مکان کے آہنی پھاٹک کے عین مقابل اُسے ایک پہاڑی ٹانگہ رکتا نظر آیا جس سے اُسکا بھائی اور محمد صادق اپنے اپنے بیگ سنبھالے ہوئے نکلے۔

ٹانگے کی آہٹ سُن کر بوڑھا پادری کُرسی سے انگڑائی لیکر اُٹھا اور فلورا اُسکے نزدیک آکر کھڑی ہوگئی۔ محمد صادق دوہرے جسم کا نہایت مضبوط تیئس سالہ بے ریش و برو ت نوجوان تھا۔ اُسکی رنگت قدرے سفید اور سرخی مائل تھی۔ اُسکی آنکھیں بالکل سیاہ اور نشیلی معلوم ہوتی تھیں جن میں ایک ناقابلِ بیان کشش و جاذبیت موجود تھی۔ وہ ایک مکلف فلالین کے سوٹ میں ملبوس اپنے فرنگ نژاد دوست کے ہمراہ خراماں خراماں مکان کے برآمدے تک پہنچا جہاں دونوں نوواردوں نے معمر پادری کو سلام کیا رابرٹ پیرن نے سر سے ٹوپی اُٹھا کر اپنے بوڑھے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اجازت دیجئے کہ میں اپنے دوست میر محمد صادق کا آپ سے تعارف کراؤں" دوسرے لمحہ میں کلارک پیرن کا ہاتھ بیدار بخت محمد صادق کے ہاتھ میں تھا کہ رابرٹ نے پھر شگفتہ آواز میں کہا "اور یہ میری چھوٹی ہمشیرہ فلورا۔ اُمید ہے کہ آپ اس سے مل کر خوش ہونگے۔"

محمد صادق نے اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت جو سالخوردہ پادری کا ہاتھ گرمجوشی سے دبائے تھی، ڈھیلی چھوڑ دی اور ایک معنی خیز نگاہ سے اُس نے فلورا کی شرمیلی آنکھوں کو دیکھ کر ٹوپی اُتار دی اور آہستہ سے ہاتھ ملا کر تعظیماً اپنا سر جھکا دیا۔ حسین فلورا کے دل میں ہندوستانی مسلمان کی نسبت جو شبہات تھے وہ یک قلم کافور ہو گئے۔ کیونکہ بادی النظر میں وہ ایک مہذب انگریز معلوم ہوتا تھا۔ سوائے اسکے کہ اُسکی رنگت زیادہ سے زیادہ ایک اطالی النسل باشندہ سے مشابہت رکھتی تھی۔ اُسکا لباس، اُسکی زبان اور طرزِ تکلم بعینہٖ ویسا تھا جیسا کہ خود اُسکے بھائی کا۔ پری چہرہ لڑکی کا دل دھڑکنے لگا اور اُسکی

زبان تالو سے چمٹ گئی، بالآخر اس نے نہایت دقت سے کہا " چلئے میں آپکا کمرہ دکھا دوں "۔
محمد صادق نے دوبارہ سر جھکایا اور اُسکی مہربانی و شفقت کا شکریہ ادا کر کے اُس کے پیچھے ہولیا۔ اُن دونوں کے چند قدم پیچھے رابرٹ پیرن مہمان کی عزت افزائی کے خیال سے چلا آیا۔ فلورا نے ہال سے گزر کر شرق رویہ ایک کمرہ کا دروازہ کھول دیا اور تینوں اُس میں داخل ہو گئے۔ محمد صادق نے ایک ہی نظر میں کمرہ کی تمام اشیاء کا جائزہ لے لیا پھر فلورا نے کہا " جس چیز کی آپکو ضرورت ہو بلا تکلیف کہدیجئے۔ آپکا گھر ہے " پھر ایک لمحہ سوچ کر کہنے لگی " کیا آپ آج شام میرے ہمراہ سپائی ٹن کی سیر کو چلینگے۔ یہاں سے آدھ میل کے فاصلہ پر ایک نہایت خوبصورت آبشار ہے اور شکار بھی بکثرت۔ پہاڑیوں کے عقب میں سُورج غروب ہونیکا نظارہ نہایت سہانا اور نظر نواز معلوم ہوتا ہے " یہ کہہ کر اُس نے خوبصورت کھڑکی کے کواڑ کھولدیئے جن سے سورج کی کرنیں محمد صادق کے سر پر پڑنے لگیں۔ اس وقت اُسکے خوبصورت بالوں کی نازک مانگ نہایت دلفریبی سے چمک رہی تھی۔ اور اُسکے لبوں پر ایک دلکش تبسم کھیل رہا تھا۔

فلورا کے ان الفاظ نے اُسکے بدن میں ایک حرارت پیدا کر دی۔ اُس نے بھولی بھالی دوشیزہ کے خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھ کر کہا " میں ایسے حسین مقام کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوں گا "

اس اثناء میں محمد صادق اور رابرٹ کا اسباب پہنچگیا تھا اور اول الذکر کا ایک ٹرنک اور دو خوبصورت چرمی بکس ایک مناسب مقام پر کمرہ کے اندر رکھوا کر دونو بھائی بہن باہر نکل آئے۔ محمد صادق نے دروازہ کے آگے پردہ کھینچکر اپنے کپڑے اُتارنے شروع کئے۔ چنانچہ چند منٹ تک آرام کرنیکے بعد اُس نے غسل خانہ میں قدم رکھا جہاں گرم پانی کے علاوہ ہر چیز قرینہ سے اپنے اپنے مقام پر رکھی تھی۔ غسل کر لینے کے بعد اُسے اپنا بدن ہلکا معلوم ہونے لگا کیونکہ اس وقت تک سفر کی کوفت بھی بہت کچھ دُور ہو چکی تھی۔ ایک گھنٹہ کامل

طور پر آرام کر لینے کے بعد اُس نے ایک نیا سُوٹ زیب تن کیا پھر گھڑی پر نظر جمائی اور ایک نازک چھڑی سنبھال کر کمرہ سے باہر نکلا۔ خوبصورت بنگلہ کے پائیں باغ میں فلورا اور اُسکا بھائی نہایت شوق سے اپنے مہمان کا انتظار کر رہے تھے کہ محمد صادق نمودار ہُوا۔ فلورا نے اُسے دیکھتے ہی چلا کر کہا "میر محمد صادق۔ آیئے۔ ہم مدت سے آپکا انتظار کر رہے ہیں"۔ اسکے بعد تینوں ایک پہاڑی سڑک پر ہو لئے اور آدھ گھنٹہ کے بے تکان سفر کے بعد وہ اس آبشار پر پہنچے جہاں فی الحقیقت مہر عالمتاب کے غروب ہونیکا نظارہ صرف آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی لیکن قلم اس حسین و روح فروز منظر کے قلمبند کرنے سے یکسر قاصر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب دامن مغرب میں روپوش ہونے سے پہلے آبشار کی پاکیزہ اور صاف و شفاف لہروں میں غسل کر رہا ہے۔ اگرچہ محمد صادق اس سے پیشتر وادیٔ کشمیر اور سوئٹزرلینڈ کے مناظر لطیف کا کئی بار لطف اُٹھا چکا تھا مگر اس حسین منظر' اس جلوہ گاہ فطرت نے اُسے مخمور و مدہوش بنا دیا۔ شبابِ بہار کے شگوفے' معطر و خوبصورت پھولوں کی نکہت بیزیاں' طیور مرغزار کی نغمہ سنجیاں' آبشارِ گوہر ریز کا ترنم لطیف اور عطر میں بسی ہوئی ہوائے خوشگوار اس فقید المثال وادی کی فضا کو حسن و لطافت سے یکسر معمور کر رہی تھی۔ اس ہنگامۂ طرب میں' اس تلاطم انبساط میں ان تینوں دلدادگانِ بہار کی اُکھڑی ہوئی سانس مُنہ سے اس طرح نکل رہی تھیں جیسے مضراب کو سازِ موسیقی سے علیحدہ کر لینے کے بعد بھی تاروں کی تھرتھراہٹ سے ایک ہلکی سی گونج پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جس طرح اُس نغمہ دلربا' اُس ترنم موج خیز سے اُسے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو ایک ثانیہ پیشتر خون میں حرکت' طبیعت میں کیف بیخودی پیدا کر رہا ہو' اسی طرح معلوم ہوتا تھا کہ ان فریفتگانِ حسنِ بہار کے قالب میں جان تو ہے لیکن حرکت اور سانس کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ عورت' وہ لطیف کرشمہ فطرت' جس کی برکت سے یہ معمورۂ جہاں آباد و رنگین ہے' ایسے نظر فریب نظارہ میں کس قسم کی دلاویزی پیدا کر سکتی ہے۔ محمد صادق ایک تو خود ہی موسم برشگال کی رنگینیوں سے متکیف ہو رہا

تھا کہ فلورا پیرن کے حسنِ شکیب سوز نے اُسکے جذبات و حسیات کی نزاکتوں میں ایک سرور، ایک لطافت، ایک مستی پیدا کر دی۔ اُس سے رہا نہ گیا وہ شعلہ رخسار لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "مس پیرن کیسی حسین وادی ہے، کیسا خوشگوار موسم ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر ان زعفران زاروں اور اس رشکِ ارم وادی کے نشیب و فراز میں غزالِ ختن کی طرح چوکڑیاں بھرتا پھروں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوس بریں کا کوئی حصہ مہ جبینانِ فرنگ کی دلبستگی اور اُنکو تمنائے بہشت سے بے نیاز کرنے کیلئے یہاں بھیجدیا ہے۔ ان خوبصورت طائرانِ ہوا کی رنگین موسیقی مجھے سرشار محبت فطرت کر رہی ہے"

اس وقت تک آفتاب غروب ہو چکا تھا مگر ایک ہلکی سی روشنی اُن پرندوں کو اپنے نشیمن تک پہنچنے میں مدد دے رہی تھی جو دن بھر کی تلاش و تجسس رزق کے بعد بسرعت اپنے اپنے قیامگاہ کی طرف اُڑے جا رہے تھے اور اُس وقت سے بیشتر جبکہ یہ اپنے مکان پر پہنچیں بزمِ انجم آراستہ ہو چکی تھی اور چودھویں رات کا مکمل چاند نہایت تزک و احتشام سے مسندِ فلک پر جلوہ فرما ہو رہا تھا،

کامل ایک ہفتہ تک محمد صادق، فلورا اور رابرٹ کے ہمراہ اس وادی گل پوش کے خوبصورت مناظر سے بہرہ اندوز ہوتا رہا۔ ایک دن جبکہ فلورا اُسکے ساتھ اکیلی ہی سیر کے لئے گئی تو اُس نے نہایت دردبھری آواز میں کہا "جب میں انگلستان کی سرزمین سے دور ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھونگا تو عورتوں کی صحبت سے یکسر محروم ہو جاؤنگا آہ! کاش کوئی ایسا مصلح معاشرت پیدا ہو جائے جو ہماری تہذیب و تمدن کا رُخ پلٹ دے"

یہ سُنتے ہی فلورا کے چہرے پر ایک اضطراب زا استعجاب پیدا ہوا وہ اپنی خوبصورت پیشانی پر شکن ڈال کر بولی "تو کیا آپکے ملک میں عورتیں ایسی آزاد نہیں۔ جیسے ہیں۔ کیا اُنہیں گھوڑے پر سوار ہونے، ناچنے، بائیسکل پر چڑھنے اور مردوں کی معیت کے بغیر

سفر کرنے کی آزادی نہیں۔ کم از کم مجھے تو اس کا یقین نہیں آتا۔"

محمد صادق کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن اُس نے مصنوعی تبسم سے فلورا کی طرف دیکھ کر کہا "اگر اُنہیں ان باتوں سے کسی ایک کی بھی ترغیب دی جائے تو وہ اسے اپنے مذہبی فرائض کی تکمیل وبجا آوری اور اپنی شرم وحیا پر ایک نہایت شرمناک اور ذلیل حملہ تصور کرینگی۔"

"حیرت ہے" دوسرے لمحہ میں پری تمثال لڑکی کے منہ سے نکلا "میرے خیال میں کسی آدمی کو اُنہیں بتانا چاہئے کہ یہ تمام آزادی کی نعمتیں جو ہمارے لئے باعث مسرت وصحت ہیں، بغیر کسی تصنع وتکلف کے ہماری بن سکتی ہیں"

جواں سال مسلمان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی وہ اپنے اضطراب کو چھپا کر دبی آواز میں بولا "آہ! یہی تو میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص پیدا ہوجائے جو اُنہیں اپنے توہمات اور اُنکے پُرحماقت رسم ورواج سے خبردار کردے اور اُنہیں بتائے کہ آزادی کی چند نشاط انگیز گھڑیاں جینا کنج تنہائی کی عمر نوحؑ بسر کرنے سے بہتر ہے۔"

یہ سنتے ہی فلورا ایک گہری سوچ میں پڑ گئی۔ درحقیقت ہندوستانی طبقۂ نسواں کی اس تنگ خیالی پر اُسے نہایت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ کونسے مذہبی احکام ایسے ہو سکتے ہیں جنکی بجا آوری اُنہیں گھر کی چاردیواری میں محبوس رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ وہ خود آزادی کی دلدادہ تھی لیکن خباثت نفس سے اُسکا دامن بے لوث تھا۔ کئی بار سوچنے کے باوجود اُسکے ذہن میں کوئی ایسی بات نہ سما سکی جو اُسے مطمئن کردیتی کہ مردوں کی صحبت میں آزادانہ رہنے سے ایک نوجوان عورت کو کن خطرات کا سامنا ہو سکتا ہے لیکن یکایک کسی خیال کے برق رو تیزی کے ساتھ دماغ میں آجانے کے باعث وہ منہ پھاڑ کر بولی "اگر میں اس قابل ہوتی تو اس نیک کام میں

تمہاری ضرور مدد کرتی"

یہ الفاظ کچھ ایسی سادگی اور صداقت کے ساتھ ادا ہوئے کہ محمد صادق کے دل میں خوشی و مسرت کے ساتھ ایک دھڑکن پیدا ہوگئی اس نے ہاتھ سے ایک چھوٹا سا پتھر پہاڑی کے نیچے پھینکتے ہوئے کہا "اگر آپ اس معاملہ میں مجھے مدد دے سکتی ہوں پھر کسی قسم کا انکار تو نہ ہوگا؟"

فلورا کے چہرہ پر بے پروائی کی علامات پیدا ہوئیں وہ دونوں ہاتھوں کو دبا کر بولی "آپ جانتے ہیں کہ میں کوئی ایسا کام کرنے سے کبھی دریغ کر سکتی ہوں جس کی تہ میں صنف لطیف کی فلاح و بہبودی مضمر ہو مگر سوال یہ ہے کہ میں کیونکر کروں؟"

خوبصورت فلورا کے جواب سے نوجوان کے جسم میں دگنی حرارت پیدا ہوگئی۔ اسکے خیالات اسے کسی اور طرف لے گئے۔ چنانچہ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد اس نے امید و بیم کی کشمکش میں کہا "آپ میری بیوی بن کر میری مدد کر سکتی ہیں"

یہ غیر متوقع جواب سنتے ہی فلورا نے زہریلے سانپ کی طرح سر اٹھایا۔ اس کے بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی اور آنِ واحد میں عرقِ انفعال نے اسکا تمام بدن پسینہ سے شرابور کر دیا۔ لیکن اس آواز میں ایک خاص التجا تھی جس نے بجائے خفگی کے اسکے دل میں ایک قسم کا رحم پیدا کر دیا۔ ایسا فقرہ ادا کر دینے کے بعد محمد صادق کے لئے خاموش رہنا درست نہ تھا۔ اس نے فلورا کے روبرو اس مقدس کام کا ایک پروگرام پیش کر دیا جو چند ثانیہ پیشتر انکے زیر بحث تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح وہ اکٹھے رہ کر قوانین آزادی کی نشر و اشاعت کر سکتے ہیں اور میاں بیوی کا سوال وہ اپنی ذات کیلئے نہیں بلکہ اس نیک اور کار عظیم کی خاطر پیش کر رہا ہے جو ان دونوں کے مدنظر ہے۔

اس کام کی اہمیت فلورا کے نزدیک بھی کچھ کم نہ تھی۔ اگر محمد صادق محض اپنی محبت آمیز گفتگو سے اس لعبت فرنگ کو مرعوب کرنا چاہتا تو یہ قطعاً ناممکن تھا اور نہ وہ

ایسے تعشق انگیز خیالات کے اظہار کا موقع دینا ہی مناسب سمجھتی۔ خود اُس کے نزدیک کسی متمول یا متوسط درجہ کے آدمی کی بیوی بن کر ایک قسم کی "آرام طلب" زندگی بسر کرنا محض حیوانوں کا سا کام تھا۔ وہ کئی سال سے کسی ایسے رفاہ عام کے کام کی تلاش میں تھی جو اُس کو دن رات مشغول رکھے اور اُس کی تمامتر توجہ کو مبذول کرلے۔ وہ کسی ایسی گمنام دنیا میں جاکر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی تھی جہاں اُسے کوئی نہ جانتا ہو اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم سب نیک بن جاؤ اور ایک دوسرے سے محبّت کرنا سیکھو۔ وہ موقع جس کی نسبت وہ دن رات سوچتی تھی بالآخر خود بخود اُسکے سامنے آگیا لیکن ایک ہندوستانی، مفتوح قوم کے ایک فرد اور پھر مسلمان سے شادی کرلینا اُسکے بس کا سوال نہ تھا۔ وہ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں نہایت محویت سے کچھ سوچ رہی تھی کہ پھر وہی پُر خلوص دل سے نکلی ہوئی، وہ محبّت و صداقت سے لبریز آواز اُسکے کان میں پہنچی اور اس انداز کے ساتھ کہ اُسکے جواب میں انکار کرنا ناگریز ہوگیا۔ اُس نے کہا "مس پیرن ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کام کتنا نیک اور کیسا اہم ہے۔ غور کرو کہ تمہاری آزادی و خود مختاری کی مثال میرے ملک کی مستورات کے لئے کتنی مفید ہوگی۔ کسی غیر قوم کی تربیت و فلاح کے لئے اپنی زندگی وقف کردینا کیا اس سے بھی کوئی شریف تر اور پاکیزہ کام ہو سکتا ہے۔ یہ ایثار، یہ قربانی ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ خاص مقدس روحیں جنہیں قسام ازل اس کام کے لئے منتخب کرتا ہے اس مشکل ترین خدمت کی وہی حامل ہو سکتی ہیں۔"

فلورا کے چہرے پر معاً سُرخی پھیل گئی اور خیالات کے ہجوم نے اُسے کسی فیصلہ پر پہنچنے سے قطعاً محروم کردیا۔ محمد صادق کے چال چلن یا اُسکی شکل و صورت میں اُسے کوئی نقص نظر نہ آتا تھا وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اگرچہ محمد صادق ایک غیر ملکی باشندہ ہے۔ مگر اُس سے شادی کرلینے کے بہت جلد بعد اُسکی شکل و صورت سے مانوس اور

اُسکے اطوار و عادات کی خوگر ہو جائیگی ۔ پھر بھی ایک بدگمانی اس اجنبی مُسلمان کی طرف سے ضرور تھی، وہ اس لیئے پیدا ہوئی کہ اُسکا مذہب صرف اسلام ہی کو عیسائیت کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ لیکن اس وقت تک خود اُسکے دل میں محمد صادق کی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ اُس نے ان تمام بندھنوں کو توڑ کر کہا" میر محمد صادق میں اس عزت افزائی کی ممنون ہوں۔ لیکن مجھے اس بات پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت چاہیئے۔ کیا آپکے ساتھ شادی کرنے کے علاوہ اَور کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا جس سے میں آپکی مدد کر سکوں "

"نہیں" مضطرب آواز کے ساتھ اُس نے منہ پھاڑ کر کہا" بالکل نہیں۔ جو کام آپ ہماری مستورات میں میری بیوی بن کر سرانجام دے سکتی ہیں وہ کسی دیگر طریقہ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ سب سے پیشتر ہمارے خاندان میں ایک حیثیت حاصل کریں پھر میں آپکی تعلیمات، آپکے خیالاتِ آزادی کی تائید کرونگا۔ جب ہمارے ہاتھ کے سینچے ہوئے نہال پھل لائینگے تو کیا ہمیں ویسی خوشی نصیب ہو سکتی ہے جو ہم میاں بیوی ہونیکی حیثیت میں محسوس کرینگے ؟"

آفتاب بسرعت غروب ہوتا چلا جا رہا تھا اور اُسکی سنہری شعاعیں اردگرد کی پہاڑیوں کو روپہلی رنگ دے رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ اگر وہ زیادہ دیر تک باتوں میں مشغول رہے تو کھانیکے وقت تک گھر نہ پہنچ سکینگے، فلورا نے ذرا سریلی آواز میں کہا" میں کل صبح تک جواب دے سکونگی "

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی اور محمد صادق بھی اپنی ٹوپی سنبھال کر اُٹھ بیٹھا۔ دونوں چہل قدمی کرتے گھر کی طرف واپس ہولئے۔ جب وہ باغ کے بڑے پھاٹک کے نزدیک پہنچے تو محمد صادق نے فلورا کو ٹھیرا کر کہا" صرف ایک بات اَور پوچھنا چاہتا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے محبت بھری نگاہوں سے حور طلعت عورت کو دیکھ کر کہا" کیا ہندوستان کی آب و ہوا سے

آپ گھبرا تو نہ جائینگی؟"

"بالکل نہیں" خوبصورت لڑکی نے نہایت شگفتہ آواز میں جواب دیا لیکن محمد صادق کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے کیونکہ یہ کوئی ایسا سوال نہ تھا جس کے لئے وہ خاص طور پر روک لی گئی تھی۔ بالاخر اُس نے نہایت جرات کیساتھ جی کڑا کر کے پوچھا "کیا آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں؟"

محمد صادق کی تمام عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے ایک عورت کے رو برو ایسا فقرہ کہا ہو۔ اگرچہ وہ مختلف مواقعات پر لنڈن، گلاسکو اور انگلستان کے متعدد شہروں کی فیشن ایبل سوسائٹیوں میں مختلف قماش کی عورتوں کی صحبت میں رہ چکا تھا مگر آج سے پیشتر اُسے کسی انگریز عورت کے ساتھ شادی کرنیکا خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ جس طرح یہ خاص فقرہ محمد صادق کے لئے نیا تھا اُسی طرح فلورا کے کان بھی اُس سے نا آشنا تھے مگر اُس نے بھولے پن کے ساتھ پُر تبسم ہونٹوں سے جوابدیا "بہت .... بڑی"

× × × × × × × × × × × × × ×

محمد صادق اور پری چہرہ فلورا کے مابین اس بات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ وہ اُسکی زوجیت میں آنے کو تیار تھی بقیہ کام کوئی ایسا وقت طلب نہ تھا۔ پادری پیرن نے بھی اُسکی اجازت دیدی اور انگریزی قانون کے مطابق اُنکا عقد ہو گیا اس سمجھوتہ پر کہ ہندوستان پہنچکر شریعت اسلامیہ کے مطابق اُن کا پھر نکاح پڑھا جائیگا۔

ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے پندرہ ہی دن بعد محمد صادق کو اسسٹنٹ انجینئر کی آسامی مل گئی۔ ایک ہفتہ کے قلیل عرصہ میں وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے اتنے عرصہ کی جدائی کے بعد مل کر سیر بھی نہ ہوا تھا کہ ایک ویران پہاڑی علاقہ کا سفر درپیش ہو گیا چونکہ فلورا ہندوستانی زبان سے محض نابلد بغیر محمد صادق کی مدد کے کسی مرد یا عورت کیساتھ اچھی طرح گفتگو بھی نہ کر سکتی تھی اس لئے اپنے لوگوں میں چھوڑنا اُسے گوارا نہ ہوا۔ اگرچہ

گھر پہنچنے کے دوسرے ہی دن بعد اُن کا نکاح ہوگیا تھا مگر محمد صادق کے تمام رشتہ داروں نے، سوائے اُسکی چھوٹی ہمشیرہ کے، اس شادی کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ اُسکی بوڑھی والدہ اور رشتہ کی دیگر عورتیں اُسکی شادی کے لئے خدا معلوم دل میں کیسے کیسے ارمان لئے بیٹھی تھیں کہ اُنکی توقع کے خلاف لڑکا خود بخود بیاہا ہوا گھر آگیا جس سے اُنکی جملہ اُمیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھر گیا۔ جس مقصدِ عظیم کو مدِ نظر رکھ کر محمد صادق نے فلورا سے شادی کی درخواست کی تھی اُسکی کامیابی میں بھی اُسے شُبہ ہوگیا۔ اُن چند دنوں میں اُسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ گھر کی کوئی معزز خاتون آزادی وخود مختاری کا سبق پڑھ کر پردہ کی قیود سے آزاد ہونے کو تیار نہ تھی۔ ایسے حالات کے گرد وپیش ہوتے ہوئے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنی انگریزی النسل بیوی کو لیکر فوراً کترو چلا جائے کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ اگر فلورا کو اس بات کا علم ہوگیا کہ جس غرض کے لئے اُس نے اپنا عزیز وطن اور خویش واقارب چھوڑ دے اور غیر مذہب اور غیر ملک کے باشندہ سے شادی کر کے ہزاروں فرسنگ کا سفر اختیار کیا ہے اس میں ایسی صریح ناکامی ہوئی ہے، تو یہ امر اسکے لئے باعث ندامت ہوگا۔

دوسرے دن علی الصبح دونوں میاں بیوی کا اسباب باندھا گیا اور وہ گھر والوں سے ایک قسم کی ناراضی کے ساتھ اپنے صدر مقام کی طرف روانہ ہوگئے۔ شام کو چھ بجے وہ اماپور سٹیشن پر اُترے جہاں سے پچیس میل دور کماؤں کی سرسبز بلند پہاڑیوں کے وسط میں اُنکا صدر مقام تھا۔ رات اُنہوں نے ڈاک بنگلہ میں بسر کی اور علی الصبح طلوع آفتاب سے پیشتر خچروں پر اُنکا اسباب لادا گیا۔ فلورا ایک ڈانڈی میں سوار ہوگئی اور محمد صادق اسکے ساتھ پیدل ہولیا۔ پیچدار پہاڑی گزرگاہوں اور دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرتے وہ شام کے چار بجے کترو پہنچے جہاں ایک مرتفع بلند مقام پر انجنیر صاحب کا سرکاری بنگلہ تھا۔ اُسکے بالمقابل کوئی بیس ۲۰ قدم کے فاصلہ پر ڈاکٹر براؤن کی کوٹھی تھی۔

ان مکانات کے بائیں جانب غربی سلسلۂ پہاڑ پر کلرکوں اور محکمۂ ڈاک کے کوارٹر تھے۔ اور اُس سے نیچے جھیل شکر پر کام کرنیوالے مزدوروں کی سینکڑوں جھونپڑیاں تھیں۔ شکر جھیل جسکا بند بنوانے کی خاطر حکومت ہند نے نصف کروڑ روپیہ منظور کیا تھا ہر تیسرے چوتھے سال اپنی غارتگر طغیانی سے سینکڑوں گاؤں بہالے جاتی تھی اور ہزاروں بیگناہ انسانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہوجاتی تھیں۔ محمد صادق کی کوٹھی سے ایک میل مشرق کی جانب جھیل کے نزدیک ایک بلند پہاڑی پر میجر بارٹن انجینئر انچارج کا خوبصورت بنگلہ اور اس کا دفتر تھا۔ صبح دس بجے کے قریب محمد صادق اپنے افسر کے سامنے ضروری احکامات وہدایات کے لئے پیش ہوا اور سورج غروب ہونے تک وسیع جھیل کے نشیب فراز کو دیکھتا رہا۔

محمد صادق کو اپنی نئی آسامی پر کام کرتے چھ ماہ سے زائد عرصہ ہوگیا۔ اس اثناء میں وہ سرکاری عملہ کے تمام آدمیوں سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ ان سینکڑوں آدمیوں میں صرف ڈاکٹر ہی ایک ایسا آدمی تھا جسکا فلورا کے ساتھ ملنا وہ پسند نہ کرتا تھا ڈاکٹر براؤن ادھیڑ عمر کا طویل القامت فربہ اندام آدمی تھا۔ اُسکی شلجم جیسی رنگت تنگ پیشانی۔ قدرے نیلگوں چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ لمبی اور خمیدہ ناک۔ مضبوط بیضاوی زنخداں ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کوئی شریف النفس آدمی نہ تھا۔ البتہ اُس کی گفتگو میں ایک خاص جاذبیت اور دلکشی تھی کہ انسان گھنٹوں اُسکی باتیں سُنے اور سیر نہ ہو۔ اُس کا وقت بے وقت فلورا سے ملنا اور سیر کے بہانے ہمراہ لے جانا اُس کے خاوند کو سخت شاق گزرتا تھا۔ ایک دن جب صبح کے ناشتہ سے فارغ ہوکر فلورا کہیں جانے کو تیار ہوئی تو محمد صادق نے ذرا ترشروئی سے پوچھا "ایں۔ اتنی سویرے کدھر جانیکا ارادہ ہے؟"

فلورا نے مستعدی سے جوابدیا "میں آج ڈاکٹر براؤن کے ساتھ دُور تک اُس

پہاڑی نالہ کو دیکھنے جا رہی ہوں جو ہر سال گرد و نواح کے سینکڑوں مواضعات تباہ و غارت کر دیتا ہے۔"

نوجوان انجینئر کے دل میں سینکڑوں شبہات پیدا ہو گئے۔ گذشتہ ایام میں وہ ڈاکٹر براؤن کی نسبت نہ صرف میجر بارٹن بلکہ ماتحت عملہ کی زبان سے بھی بہت کچھ سُن چکا تھا۔ اُسکے سینے میں رشک و رقابت کی آگ مشتعل ہو گئی لیکن دلی اضطراب چھپا کر ذرا متحمل لہجہ میں بولا "لیکن پہاڑی نالہ دیکھنے کا یہ کوئی موسم نہیں۔ جھیل کی حالت مخدوش سی ہے۔ نہیں معلوم کہ بند کب ٹوٹ پڑے۔ اسکے علاوہ میں اُس بدطینت آدمی کا تمہارے ساتھ زیادہ ارتباط پسند نہیں کرتا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نہ صرف صدر مقام بلکہ تمام شریف مجالس میں وہ بدنام و رسوا ہو چکا ہے، کم از کم میں اپنی ذات کے لئے اور اس سے بڑھ کر تمہاری نسبت کسی شخص کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہیں سُننا چاہتا جس سے میری عزت و آبرو میں فرق آئے۔ میں ایسی میل ملاقات کو بند کرنا چاہتا ہوں اور نہایت سختی کے ساتھ، سُنا مائی ڈیئر"

یہ سُنتے ہی فلورا کے دماغ میں ایک لحظہ کے لئے خون جم گیا۔ وہ ایک مرمریں بت کی طرح کھڑی رہ گئی۔ کیا یہ وہی آدمی تھا جو آج سے آٹھ ماہ پیشتر اپنی قوم کی مستورات میں آزادی و خود اختیاری کی روح پھونکنے کے لئے اُسکی مدد کا ملتجی تھا اور آج یہ ایک وقت ہے کہ خود اُسے بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے سے روکتا ہے۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ ان ناگفتنی فقرات کا متکلم وہی محمد صادق ہے جو عورتوں کی صحبت میں رہنے کا شایق، اُنکے مطالبۂ حقوق آزادی کا حامی اور اُنکی انتہائی قدر و منزلت کا دعویدار تھا۔ فلورا کے منتشر و پراگندہ خیالات ایک عمیق نقطے کی صورت میں جمع ہو گئے اور صرف اس وقت یہ بات اُسے معلوم ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کے سامنے کھڑی ہے دوسرے لمحہ میں اُس نے ذرا جرأت آمیز آواز میں جواب دیا "لیکن صادق تمہیں ایسا

حاسد اور تنگ خیال نہ ہونا چاہیئے۔ میں خود اپنی حفاظت کرنیکے لایق ہوں مجھے بالکل نادان بچہ مت تصور کرو۔"

محمد صادق کے دل میں اضطراب کی چنگاری چمک اُٹھی وہ چلا کر کہنے لگا "بس۔ یہی سب سے بڑی بیوقوفی کی بات تمہارے دماغ میں سما چکی ہے جس سے وہ ذلیل ترین آدمی ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ میجر بارٹن کا چپڑاسی ہانپتا ہوا کمرہ کے اندر داخل ہوا پھر سلام کرکے کہنے لگا "صاحب بہادر نے بلایا ہے جھیل کا بند ٹوٹنے کو تیار ہے۔"

یہ سُنتے ہی محمد صادق نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور چند منٹوں میں اپنے کپڑے بدل کر باہر نکلا پھر فلورا کی جانب جو ایک مکلف کرسی میں بیٹھی بڑی محویت کے ساتھ کچھ سوچ رہی تھی، مخاطب ہوکر کہنے لگا "فلورا پیاری! دیکھو میرا کہا مانو اور ڈاکٹر براؤن سے تمام راہ ورسوم یکقلم موقوف کردو۔ آج نیچے جھونپڑی میں بھی نہ جانا۔ شمالی پہاڑیوں میں متواتر تین دن سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور بیشمار پانی جھیل میں جمع ہو رہا ہے نہیں معلوم کب اس کا دہانہ پھٹ پڑے۔ خدا محفوظ رکھے سخت طوفان کا خطرہ ہے" یہ کہہ کر اُس نے اپنی بیوی کی نازک وخوبصورت پیشانی کو چوما اور کسی قسم کا جواب سُنے بغیر بعجلت جھیل کی طرف روانہ ہوگیا۔

تمام دن کی سرتوڑ محنت کے بعد سانحورده میجر بارٹن نے یہ فیصلہ کیا کہ پانی کی روک تھام اب انسانی قبضہ قدرت سے باہر ہے۔ اُسی وقت تمام مقامات پر تار دے دئے گئے کہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹہ میں جھیل کا بند ٹوٹ جائیگا۔ مزید وقت یہ پیدا ہوگئی کہ موسلا دھار بارش کوئی کام نہ کرنے دیتی تھی۔ اس وقت شام کے چھ بج چکے تھے اور محمد صادق مینہ میں شرابور گھر پہنچا۔ جب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ڈرائنگ روم میں اُس نے فلورا اور ڈاکٹر براؤن کو انگیٹھی کے سامنے

آگ تاپتے پایا۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سنتے ہی دونوں نے پچھلی جانب منہ پھیر دیئے اور محمد صادق کو خلاف توقع اپنے سر پر کھڑا دیکھنے سے اُن دونوں کی رنگت فق ہو گئی۔ اُن کا خیال تھا کہ جب جھیل کی حالت ایسی نازک ہے تو تمام عملہ وہیں اپنے خیموں میں رات بسر کریگا۔ کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی محمد صادق نے اپنی ٹوپی اور برساتی اتار کر ایک کرسی پر رکھدی پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا عین ان کے مقابل آکھڑا ہؤا۔ کمرہ میں اس وقت ایک موت کا سا سکوت طاری تھا البتہ طوفان کی خوفناک صدائیں اس خاموشی میں ضرور مداخلت کر رہی تھیں۔ ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد اُس نے ڈاکٹر براؤن کی طرف مخاطب ہو کر کہا "ڈاکٹر صاحب آپ تشریف لے جایئے اور آئندہ کبھی میرے بنگلہ میں قدم نہ رکھیں۔ بس یہی سب سے زیادہ شریفانہ سلوک ہے جو میں آپکے ساتھ روا رکھ سکتا ہوں"

یہ سنتے ہی ڈاکٹر براؤن کے جسم میں رعشہ پڑ گیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ اُس نے دھندلی نگاہوں سے مضبوط و جسیم ہندوستانی کو دیکھا اور پاس کی کرسی سے ٹوپی اُٹھا کر کمرہ سے باہر نکل گیا۔ میاں بیوی کچھ عرصہ تک ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔ محمد صادق کے بدن میں اس وقت غصہ و ندامت کی آگ مشتعل ہو رہی تھی اور فلورا اپنی عزت نفس کے مجروح ہو جانے سے تڑپ رہی تھی۔ اُسکے نزدیک ڈاکٹر براؤن اُسکے ہموطن اور ہمقوم آدمی کو اس طرح دھتکار کر نکال دینا پرلے درجے کی کمینگی اور ناانصافی تھی۔ اُس کے حساس دل میں باغیانہ منصوبوں نے ہجوم کرنا شروع کر دیا اور اُسکا گرم سانس بڑی تیزی کے ساتھ نکلنے لگا۔ معاً محمد صادق کی نگاہ ایک کتاب پر جا پڑی جو پاس کی تپائی پر رکھی تھی، اُس نے اُٹھا کر اُسکی خوبصورت جلد کو دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ اس قسم کی کتاب سوائے ڈاکٹر براؤن کے اَور کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اُس نے پہلا ورق اُلٹا تو ڈاکٹر

مخصوص دستخط میں انگریزی کا یہ شعر لکھا نظر آیا ؎

جام شراب و نقل کباب اور تجھ سا دوست
اس دشت کی مثال بہشت بریں نہیں

اُس نے ایک بار پھر کتاب کی جلد کو دیکھا اور دوسرے لمحہ میں کھڑکی کھول کر نہایت غصہ کے ساتھ اُسے پہاڑی کے نیچے پھینک دیا۔ پھر دروازہ بند کر کے کہنے لگا "یہ ہے درحقیقت وہ چیز جو تمہارے دل کو مسموم اور تمہارے دماغ کو مسحور کئے ہوئے ہے۔"

غصہ و ندامت کے جوش سے فلورا کا چہرہ تمتما اُٹھا، وہ برق رو تیزی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اُس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اُس کی زبان تالو سے چمٹ گئی تھی لیکن بڑی دقت کے ساتھ اُس نے کہا "صادق۔ اس بات کو جانے دو وہ بالکل بے قصور ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے خاوند کی طرف دیکھا مگر محمد صادق نے اس خاموش سفارش کی کچھ پروا نہ کی وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آیا اور فلورا کی کلائی پکڑ کر کہنے لگا "بے قصور ہے، لیکن جب میں اتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اُس کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات چھوڑ دو تو کیا وجہ ہے کہ تم میری بات پر دھیان نہیں دیتیں، کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ آئندہ اُس سے کبھی نہ ملو گی اور اگر تم اس بات سے باز نہ آؤ گی تو یاد رکھو میں اُسے گولی مار دونگا اور تمہیں ——— تمہیں بھی مار ڈالونگا۔"

یہ رعد کی طرح گرجتی ہوئی آواز سُن کر فلورا کانپ گئی اور موٹے موٹے آنسو اُس کے سُرخ رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ ایک سسکی لیکر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "صادق، ظالم، میرا ہاتھ چھوڑ دے۔ میں ایسے ذلیل سلوک کی تم سے

کبھی متوقع نہ تھی۔ بس مجھ سے یہ نہیں برداشت نہ ہو سکتا۔"

محمد صادق نے آہستہ سے اُسکا ہاتھ تھپتھپا دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہنے لگا" کیا تم وعدہ کرتی ہو؟"

فلورا نے دونوں ہاتھ ڈھال کی صورت اپنے چہرے پر رکھ لئے جیسے اُس کی مار سے بچنا چاہتی تھی مگر محمد صادق کے سوال کا جواب نہ تھا۔ اُس نے پھر ایک بار کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا" کیا تم مجھ سے وعدہ کرتی ہو؟"

کسی قسم کا جواب دینے کی بجائے وہ بڑی تیزی سے دروازہ کی طرف لپکی اور اُس آندھی و بارش کے طوفان میں باہر نکل گئی۔ محمد صادق ایک لمحہ تک بت بنا اُس کی مجنونانہ حرکت کو دیکھتا رہا پھر دروازہ کے نزدیک آیا اور بجلی کی روشنی میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر براؤن کے بنگلہ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ کمرہ میں واپس آگیا اور کئی منٹوں تک ساکت بےحس و حرکت کھڑا رہا۔ دوسرے لمحہ میں اُس کے مُنہ سے ایک بلند قہقہہ نکل آیا۔ لیکن اس قہقہہ سے اُسکی خوابیدہ حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔ اُسکی آنکھیں مجروح چیتے کی طرح چمکنے لگیں اور جوش غیرت سے اُس نے اپنے ہاتھوں کی گرم مٹھیاں بند کر لیں۔ اُسے کبھی گوارا نہ تھا کہ فلورا اُس کی بیوی ہو کر کسی دوسرے آدمی کی پناہ ڈھونڈھے۔ کامل ایک گھنٹہ تک معاملہ کے ہر پہلو کو سوچ لینے کے بعد اُس نے میز کی دراز سے اپنا پستول نکالا اور فلورا کی طرح بارش میں بھیگتا ڈاکٹر براؤن کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اس کے گورکھا ملازم سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر میم صاحبہ کے ہمراہ آدھ گھنٹہ ہوا اسی باد و باراں کے طوفان میں پہاڑی نالے کی جھونپڑی میں چلا گیا ہے۔ محمد صادق ابھی کچھ پوچھنے ہی کو تھا کہ ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی جیسے سینکڑوں توپیں ایک ساتھ سر کر دی ہوں۔ اُ فوراً سمجھ لیا کہ یہ جھیل کا بند ٹوٹنے کی آواز تھی اور چند منٹوں میں [illegible] زبر

طوفان آنے والا تھا۔ وہ کسی خیال کے دماغ میں یک لخت سما جانے کے باعث پہاڑی سے اُترنے لگا اور اندھیرے میں بدقت اپنے کو بچاتا ہوا وہ نالے تک پہنچا مگر اُس میں اس وقت تک بہت زیادہ پانی آچکا تھا اور جھونپڑی کے فوراً تباہ ہوجانے کی اُمید تھی۔ محمد صادق نے حوصلہ وہمت سے اپنے آپ کو سرد پانی کی تیز وتند لہروں میں ڈال دیا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ جھونپڑی کے قریب جا پہنچا جہاں ایک طوفانی لالٹین کی مدہم روشنی بتا رہی تھی کہ فلورا اور براؤن اُس میں ضرور تھے، جھونپڑی میں پانی بھر رہا تھا اور چند منٹوں کے بعد اُسکے مکینوں کے غرقاب ہوجانے کی اُمید غالب تھی۔ محمد صادق نے جب اُسکے اندر قدم رکھا تو دونوں سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ڈاکٹر براؤن نے فوراً اُسکے آگے ہاتھ جوڑ دیئے پھر نہایت مضطرب آواز میں کہنے لگا "مسٹر صادق۔ خدارا مجھے بچاؤ میں تیرنا نہیں جانتا" یہ کہہ کر وہ جھونپڑی کے پچھلے حصہ سے گھٹنوں پانی چیرتا اُسکے سامنے آکھڑا ہوا اور نہایت زاری سے اپنے بچاؤ کی التجا کرنے لگا۔ محمد صادق نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اب کیا پیش آنے والا تھا۔ اسکی ایک نگاہ ڈاکٹر براؤن کے چہرے پر تھی اور دوسری فلورا اپنی بیوی کی طرف جو اُس دھندلی روشنی میں سر جھکائے شاید یہی سوچ رہی تھی کہ آخر کار محمد صادق اُن دونوں کو ہلاک کردیگا۔ اس طرح خاموشی کے ساتھ ہر لمحہ ضائع کرنا۔ غرض جان پر کھیل جانا تھا اُس نے وقت کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر براؤن کی طرف دیکھ کر کہا "ڈاکٹر، اگر میں تمہاری جان بچانے میں کامیاب ہوجاؤں تو اس خدمت کے عوض تم مجھ سے کیا سلوک کروگے؟"

" انسانی طبائع کے تغیرات جو انسان ضعیف البنیان کی جبلی وفطرتی کمزوریوں میں صرف چند منٹ پیشتر اپنے ننگ وناموس کو خطرہ میں دیکھ کر ... کی طرح جوشِ انتقام میں اُس کی جان لینے پر آمادہ تھا